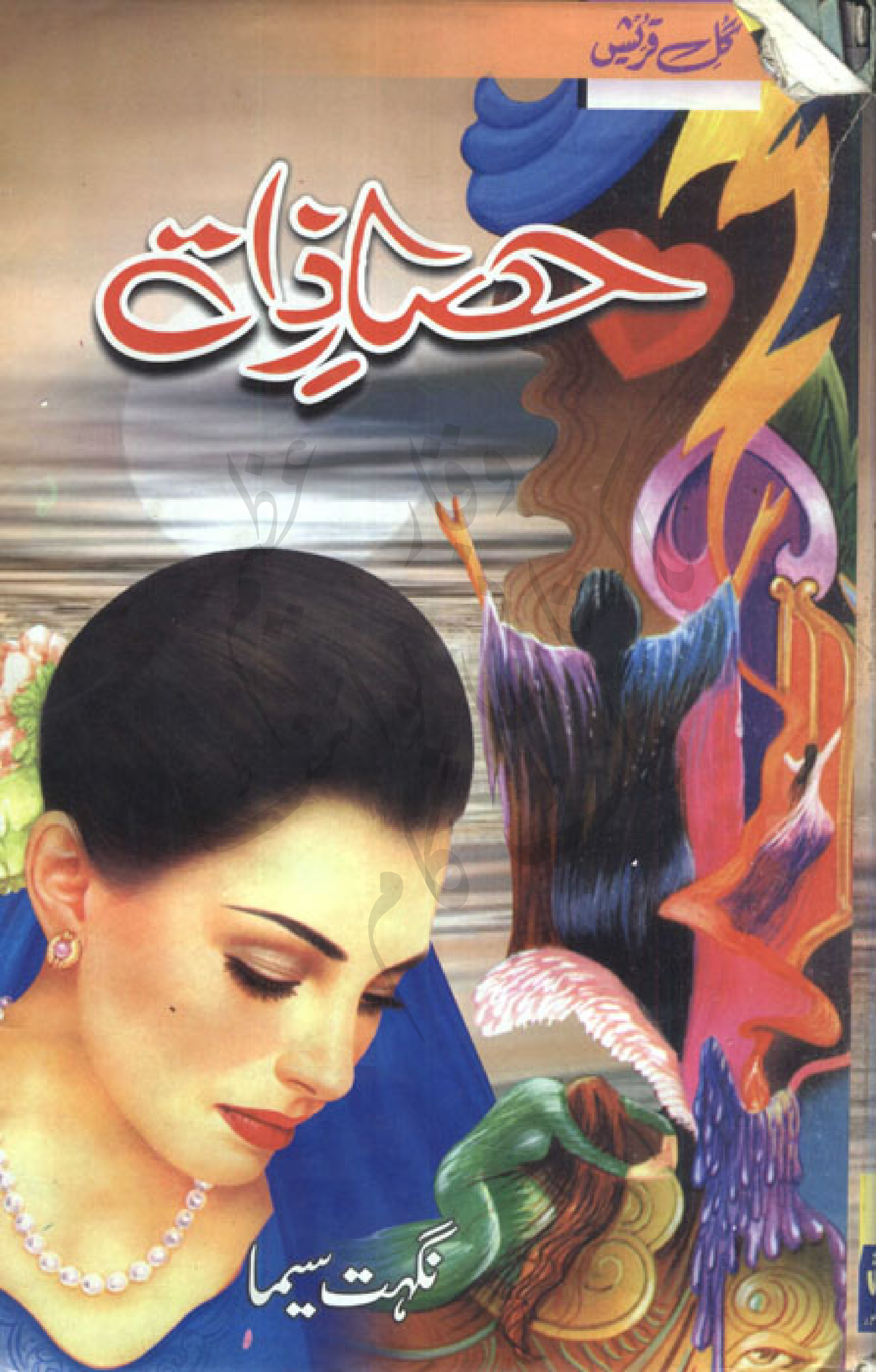
گل قریش
حصار ذات
نگہت سیما

وہ برسوں سے اپنی ذات کے حصار میں قید تھا اور اپنے اردگرد موجود محبتوں کو محسوس کرنے سے قاصر

سب محبتیں دھند میں چھپ جاتی تھیں

اور یہ سوتیلے رشتوں کے سلوک کا ردِعمل تھا کہ اُس کے اندر ایک نفسیاتی گرہ سی بن گئی تھی وہ لاشعوری طور پر دوسروں کو اذیت دے کر خوشی محسوس کرتا تھا۔ لیکن جب محبت نے اُس کے دل کو چھوا تو وہ غیر محسوس طور پر بدلتا چلا گیا ــــــ اور پھر محبت کی طاقت نے لاشعور میں چھپی نفرت کو مار دیا۔

محبت جو اس کائنات کی سب سے بڑی سچائی ہے جیت گئی

اور نفرت ہار گئی

''حصارِ ذات'' یہ ناولٹ بھی میری دوسری کتابوں کی طرح خواتین ڈائجسٹ'' میں چھپا اور مبین خٹک صاحب نے اسے کتابی شکل میں چھاپنے کا اہتمام کیا۔

میں محترم طارق اسماعیل ساگر صاحب کی ممنون ہوں کہ اُنہوں نے میرے لئے وقت نکالا اور میری تحریر کے متعلق لکھا۔ جو میرے لئے یقیناً باعثِ فخر ہے۔

امید ہے میری دوسری کتابوں کی طرح اسے بھی پسند کیا جائے گا۔

والسلام

نگہت سیما

اور آج مجھے سکندر علوی کے گھر سے آئے پورا ایک برس ہو گیا ہے۔ اور یہ ایک سال میں نے اذیتوں کے پل صراط پر گزارا ہے۔

لوگ کہتے ہیں' انتظار میں لذت ہوتی ہے۔ لیکن میں نے تو ایک ایک لمحہ جس طرح کاٹا ہے۔ میں ہی جانتی ہوں۔ ہر صبح ایک امید کے ساتھ طلوع ہوتی ہے' رات کو ایک طویل تھکن کے ساتھ جب میں اپنے بستر پر لیٹتی ہوں تو میری آنکھیں موتیوں کے ہار پروتی ہیں۔ پتا نہیں کیوں مجھے اس کا اتنا انتظار ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے یقین ہے کہ وہ لوٹ آئے گا۔ وہ مجھے واپس بلا لے گا۔

حالانکہ اس کے ساتھ گزارا ہوا کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں ہے جو میرے یقین کو پختہ کرے۔ پھر بھی ایک انتظار ہے جو ختم نہیں ہوتا۔ ابھی کل ہی بلال کہہ رہا تھا۔

''اوج! کیوں اپنے آپ کو اذیت دیتی ہو۔ تمہیں ابھی ایک طویل زندگی گزارنی

......تم اُس سے آزادی مانگ لو اور اگر وہ انکار کرے تو عدالت کا سہارا لو۔''

اور بلال کی بات پر میرے اندر جیسے بارش ہونے لگی تھی۔

''نہیں، مجھے سکندر سے رہائی نہیں چاہئے۔ ایک روز شاید ایک روز وہ لوٹ ئے۔۔۔وہ دل کا برا نہیں ہے۔ بس اس کیساتھ کوئی پرابلم ہے کوئی نفسیاتی پرابلم۔''

اور بلال مجھ پر ایک ترحم بھری نظر ڈال کر خاموش ہو گیا تھا۔ میں جانتی ہوں میری سے سب دکھی ہیں۔ ڈیڈی کس قدر کمزور ہو گئے ہیں۔ ممی کو بھی چپ سی لگ گئی ہے اور ڈیڈی نی ہی بار مجھ سے معذرت کر چکے ہیں۔

''میں تم سے شرمندہ ہوں بیٹی!...... میں نے ایک دکھ کی تلافی کرنا چاہی تھی۔ ے کیا معلوم تھا کہ ایک اور دکھ مول لے لوں گا اور یہ دکھ اس دکھ سے کتنا بڑا ہے اور کتنا اذیت ک۔ اوج بیٹی! مجھے معاف کر دینا۔''

''ڈیڈی پلیز، اس طرح مت کہیں۔ یہ میری قسمت ہے۔ آپ نے تو اپنی طرف سے میرے لئے ایک بہترین لڑکا چنا تھا۔''

میں چاہتی ہوں کہ ڈیڈی کا احساس ندامت کم ہو جائے وہ شرمندہ نہ ہوں، لیکن ڈیڈی تو ہنسنا ہی بھول گئے ہیں۔

سکندر علوی ایک بہترین لڑکا تھا۔ اس میں شک ہی کیا ہے اگر ہم دونوں کا نباہ نہیں وسکا تھا تو یہ مقدر کی بات تھی، قسمت کے کھیل تھے۔ جب پہلی بار میں نے سکندر علوی کو دیکھا تو اس کی شخصیت سے متاثر ہوئی تھی۔ اس کی شخصیت میں بہت کشش تھی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ایک عجیب سا حزن تھا۔ خفگی تھی۔ ناراضی تھی۔ اور وہ بہت بے نیاز سا سعد خان کے آفس میں بیٹھا فائلوں کا مطالعہ کر رہا تھا جب سعد خان نے میرا تعارف اس سے کروایا۔

''مس اوج کمال! یہ سکندر علوی ہیں......... ہمارے سینئر انجینئر۔ بہت جینئس اور اس پراجیکٹ پر آپ ان کو اسسٹ کریں گی اور آپ کو ان کے ساتھ کام کر کے یقیناً مزا آئے گا۔''

سکندر علوی نے ذرا کی ذرا فائل سے سر اٹھا کر مجھے دیکھا تھا اور سر کے اشارے سے وش کیا تھا اور اس لمحے میں نے سوچا تھا کہ یہ شخص سکندر علوی۔ اس کا نام سکندر کسی نے بہت سوچ سمجھ کر رکھا ہے۔ اسے دیکھ کر لگتا ہے جیسے یہ واقعی دنیا فتح کرنے نکلا ہے۔ کشادہ پیشانی، اونچی اٹھی ہوئی ناک.......... میں بہت غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جب اس نے سر اٹھا کر دوبارہ مجھے دیکھا۔

''مس اوج! اگر آپ میرا تفصیلی مطالعہ کر چکی ہوں تو ہم کچھ دیر اس پراجیکٹ پر بات کر لیں۔''

میں شرمندہ ہو گئی۔ اس نے کچھ نقشے میرے سامنے پھیلائے یہ اس ہاسپٹل کا نقشہ تھا، جس پراجیکٹ پر ہمیں کام کرنا تھا، پھر ماڈل دکھایا۔ کافی دیر تک وہ مجھ سے مختلف سوالات کرتا رہا، میں نے اندازہ لگایا کہ وہ صرف مجھے جانچنا چاہتا ہے، میرے علم کو اور میری ذہانت کو اور اس فیلڈ میں میرے تجربے کو۔ میں نے دو سال پہلے ہی جاب اسٹارٹ کی تھی اور اس سے قبل کراچی آفس میں تھی۔ اور میرا زیادہ کام آفس ورک کا تھا۔ میں نے سائیٹ پر جا کر اس سے قبل کام نہیں کیا تھا۔

''لیکن اس بار تو آپ کو میرے ساتھ سائیٹ پر بھی جانا پڑے گا۔''

وہ مسکرایا تو میں نے محسوس کیا کہ اس کی مسکراہٹ بہت دلکش تھی اور اس کا تاثر اس کے پورے چہرے پر دکھائی دیتا تھا۔

''او کے!'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور اس سے اجازت لے کر اُٹھ آئی۔ ہم تین دن قبل ہی کراچی سے آئے تھے اور میں نے ممی سے وعدہ کیا تھا، کہ گھر سیٹ کرنے میں ان کی مدد کروں گی۔ دراصل ڈیڈی کی جاب کے سلسلے میں ہم طویل عرصہ سے کراچی میں مقیم تھے، اور اب جب ڈیڈی نے ریٹائرمنٹ لے لی تھی تو ممی نے فیصلہ کیا تھا کہ واپس لاہور چلا

جائے۔۔۔ لاہور میں ہمارا ذاتی گھر تھا ماڈل ٹاؤن میں جس میں مشترکہ خاندانی سسٹم کے تحت ہم سب یعنی ہمارے علاوہ میرے دو چچا بھی رہتے تھے۔ لیکن ڈیڈی کے کراچی جانے کے کچھ عرصہ بعد دونوں چچا باری باری اسٹیٹس چلے گئے۔ جس کی وجہ سے گھر بند پڑا تھا۔ صرف ایک پورشن میں کرایہ دار رہتے تھے۔

ہم تقریباً آٹھ سال بعد لاہور آئے تھے۔ اگرچہ میں اپنی جاب کی وجہ سے ابھی کراچی میں رہنا چاہتی تھی۔

لیکن پھر ممی اور ڈیڈی کی خواہش کے پیش نظر میں نے جاب چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

لیکن سعد خان نے کہا کہ صرف اس مسئلے کے لئے جاب چھوڑنا ہرگز ضروری نہیں ہے۔ ہم آپ کا ٹرانسفر لاہور کر دیتے ہیں۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا تھا کہ میں نے اپنا استعفیٰ ڈائریکٹ سعد خان کو دیا تھا' جو ان دنوں کراچی آفس میں آئے ہوئے تھے۔

آج میں صرف جوائننگ رپورٹ دینے آئی تھی۔ میں نے سعد خان کو بتا دیا تھا۔ کہ میں کل سے آفس اٹینڈ کروں گی۔

میں گھر آتے ہوئے غیر ارادی طور پر سکندر علوی کے متعلق سوچتی رہی۔ مجھے ذہین لوگ اٹریکٹ کرتے تھے۔ ذہانت میری کمزوری تھی اور میں نے سوچا تھا' واقعی اس شخص کے ساتھ کام کرنے میں مزا آئے گا۔ لیکن اگلے چند دنوں میں مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ اپنی ذہانت سے قطع نظر ایک انتہائی مشکل شخص ہے' اور اس کے ساتھ کام کرنا آسان نہیں۔ اس کے موڈ کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ اچھے خاصے موڈ میں بات کرتے کرتے یکدم اکھڑ جاتا۔ میں اسے اور اس کی فطرت کو سمجھ نہیں سکی تھی۔۔۔

وہ کبھی تو بہت مہربان اور مشفق لگتا۔ اپنے ماتحتوں کے ساتھ ہمدردی کرتا ہوا۔ ان کے دکھ سکھ میں شریک ہوتا ہوا۔

کبھی بڑی سے بڑی غلطی کو نظر انداز کر دیتا اور کبھی ذرا سی غلطی پر بے عزتی کر دیتا۔

مجھے اس کی ذہانت اٹریکٹ کرتی تھی۔ لیکن اس کی گھڑی میں ماشہ اور گھڑی میں تولہ والی کیفیت سے الجھن ہوتی تھی۔

کئی بار میں نے محسوس کیا تھا کہ میرے ساتھ اس کا رویہ باقیوں کی نسبت زیادہ سخت تھا وہ کبھی کبھی توہین آمیز ہو جاتا لیکن پتا نہیں کیوں مجھے اس پر کبھی غصہ نہیں آیا۔

یقیناً اس کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے۔ اس کی آنکھوں کا حزن بعض اوقات اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا تھا۔ ایسا لگتا جیسے اس کا وجود سرتا پا اداسی کے غبار میں لپٹا ہوا ہے۔ پتا نہیں کیوں میں اکثر اس کے متعلق تنہائی میں سوچنے لگی تھی۔ اس لئے نہیں کہ مجھے اس سے محبت ہو گئی تھی' میں ان لڑکیوں میں سے نہیں تھی' جو دل ہتھیلی پر لئے پھرتی ہیں۔

حوا کی بیٹیاں' جو کسی آدم کو دیکھ کر' بعض اوقات اپنی انا اور اپنی عزتِ نفس تک کو فراموش کر دیتی ہیں۔ مجھے عورت کا خود کو اس طرح ارزاں کر لینا ہرگز پسند نہیں ہے۔

ایک بار اپنی ایک ٹیچر سے اس موضوع پر بات کرتے ہوئے میں بہت جذباتی ہو گئی تھی۔

''ہر بات اور شے کے لئے ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ ہر ایک کو وقت پر وہ سب کچھ مل جاتا ہے' جو اسے ملنا ہوتا ہے۔ پھر ہم خود کو ارزاں کیوں کر لیتے ہیں۔''

دراصل ان دنوں ہماری ایک کلاس فیلو مونا کے متعلق یہ سنا جا رہا تھا کہ وہ کسی لڑکے کے ساتھ انوالو ہے۔ اور اکثر یونیورسٹی آنے کے بجائے اس کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے۔

اور جب میں نے اس سے پوچھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔ تو اس نے انتہائی ڈھٹائی سے کہا۔

''آج کل گھر میں بیٹھی سیدھی سادی لڑکیوں کے لئے اچھے رشتے نہیں آتے۔ اس کے لئے خود کوشش کرنا پڑتی ہے' احمد ایک اچھا لڑکا ہے۔ اچھی فیملی ہے۔ دولت ہے اور پھر اگر وہ میری طرف متوجہ ہوا ہے تو میں یہ چانس کیوں مس کروں۔''

مجھے اس کی بات پر افسوس ہوا تھا اور اس روز اپنی ایک پرانی ٹیچر سے مونا کی بات کرتے ہوئے میں جذباتی ہو گئی تھی۔

"مونا کے مقدر میں اگر احمد کا ساتھ لکھا ہے تو اسے مل جائے گا۔ لیکن پتا نہیں کیوں وہ یہ بات نہیں سمجھتی۔"

تب میڈم زبیری مسکرائی تھیں۔

"مجھے تمہارے خیالات جان کر خوشی ہوئی ہے۔

اوج! لیکن ہم بڑے مشکل دور سے گزر رہے ہیں۔ عورت نے خود کو کیوں ارزاں کر لیا ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں جن میں ایک Latemarriages (دیر سے شادیاں ہونا) بھی ہے۔"

میں سکندر سے محبت نہیں کرنے لگی تھی لیکن اس کی شخصیت کا تضاد مجھے اسے سوچنے پر مجبور کرتا تھا۔ اس روز ہم سب بہت خوشگوار موڈ میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

اسد ملک اور مسز صالحہ جو کمپیوٹر لیب کی انچارج تھیں۔ مسز مارتھا جو اکاؤنٹ آفس میں تھیں۔ سکندر نے مجھ سے کہا تھا کہ میں مس مارتھا کے آفس سے اس پراجیکٹ کی فائل لے کر سارا اسٹیٹمنٹ تیار کروں۔۔۔ اور میں۔ مجھے اس وقت پتا چلا تھا کہ مسز مارتھا کی برتھ ڈے ہے۔ اپنے ملک سے دور اس اجنبی ملک میں سب انہیں برتھ ڈے کی مبارکباد دے رہے تھے اور وہ بہت خوش لگ رہی تھیں۔ انہوں نے سب کے لئے کافی بنائی تھی۔

"اوج! کافی پی کر جاؤ۔" انہوں نے مجھے بھی روک لیا۔

یہاں کا ماحول بہت دوستانہ تھا۔ سب ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے باس سعد خان ایک بہت شفیق اور دوست قسم کے انسان تھے۔ چند ہی دنوں میں' میں بھی سب سے گھل مل گئی تھی۔ مجھے مسز مارتھا کو انکار کرنا مناسب نہ لگا۔ اور میں یہاں کافی پینے بیٹھ گئی تھی اور پھر کافی پیتے ہوئے میں اسد ملک کی کسی دلچسپ بات

پر ہنس رہی تھی کہ سکندر علوی اندر داخل ہوا۔

"مس اوج! میں نے یہاں آپ کو کام سے بھیجا تھا۔ کافی پینے نہیں۔ آپ انتہائی غیر ذمہ دار ہیں۔"

وہ بہت غصے مین بول رہا تھا اور مسز مارتھا اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

میں نے کافی کی تقریباً بھری ہوئی پیالی وہاں ہی ٹیبل پر رکھ دی اور مسز مارتھا سے فائل لے کر باہر چلی گئی' مجھے سکندر کے غصے پر حیرت ہوئی تھی۔ لیکن میں کچھ کہے بنا باہر چلی گئی تھی اور جب میں کمپیوٹر روم میں اسٹیٹمنٹ تیار کر رہی تھی تو وہ وہاں چلا آیا۔

"میرا خیال ہے مس اوج! آپ تھوڑا ریلیکس کر لیں۔ بلکہ بہتر یہی ہے کہ باقی کا کام کل کر لیں۔ ابھی سیمنٹ اور سریے کے کچھ نئے ریٹ آئے ہیں۔ میرا خیال ہے پہلے والے ریٹس کے مقابلے میں یہ زیادہ ریزن ایبل ہیں۔"

میں نے کمپیوٹر آف کر کے سکندر کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ دیر پہلے کے سکندر سے بہت مختلف لگ رہا تھا۔

"اگر آپ کو زیادہ جلدی نہ ہو تو ایک کپ کافی ہو جائے...... پلیز۔" وہ جانے کے لئے پلٹا۔

"مس مارتھا کے کمرے میں آ جایئے گا۔"

"یہ سکندر علوی کیا چیز ہے؟" اس شام میں نے اسد ملک سے پوچھا تھا۔

میری گاڑی ورکشاپ گئی ہوئی تھی اور اسد ملک نے مجھے گھر تک پہنچانے کی آفر کی تھی۔ اور میں نے کسی ویگن میں دھکے کھانے یا کسی ٹیکسی میں تنہا جانے سے بہتر یہی سمجھا کہ اسد ملک کی آفر قبول کر لوں۔

"سکندر ایک بہت پیارا بندہ ہے مس اوج! دراصل اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ بالکل اکیلا ہے۔ والدین کا اس کے بچپن میں انتقال ہو گیا تھا اور اس طرح اکیلے پلنے والے

بچے خودرو پودوں کی طرح بڑھتے ہیں۔ ان کی کانٹ چھانٹ نہیں ہوتی' اس لئے ان کی شخصیت میں بعض اوقات کئی گنجل پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ سکندر کی شخصیت ایسی نہیں ہے۔ بس وہ غصے کا تیز ہے۔ ذرا سی غلطی اس سے برداشت نہیں ہوتی۔ وہ بہت ایگریسو ہے۔''

مجھے اسد ملک کی بات سے اتفاق تھا' یہ تو بہت بعد میں مجھے جا کر احساس ہوا تھا کہ وہ صرف غصے کا ہی تیز نہیں ہے' بلکہ اس کی شخصیت میں کئی نفسیاتی گرہیں ہیں وہ کسی کو بے بس اور حقیر و لاچار جان کر خوشی محسوس کرتا ہے۔ ایسے میں کئی بار میں نے اس کے چہرے پر سکون اترتے دیکھا تھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں کے پانیوں میں اضطراب سا پیدا ہوتا۔ ہلچل سی مچتی تھی لیکن بس کچھ دیر کے لئے.... اس ہلچل میں ایک نامعلوم سی خوشی اور مسرت ہلکورے کھاتی دکھائی دیتی تھی اور پھر وہی جامد سناٹا اور نامعلوم سا حزن ان آنکھوں میں اتر آتا۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ میں نے کئی بار سوچا تھا۔

ایک بار سائٹ سے واپس آتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ بلکہ اسے مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ اپنا آپ کھول دے۔ اپنے دکھ سکھ کسی کے ساتھ شیئر کر لے۔ تب اس نے مجھے ڈانٹ دیا تھا۔

میں ہولے ہولے اس کے مزاج کی عادی ہوتی جارہی تھی۔ اور میں نے اس کے متعلق زیادہ سوچنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ جیسا بھی ہے مجھے کیا۔ ہر آدمی کی اپنی طبیعت ہوتی ہے۔ مجھے اس کے ساتھ کام کرنا ہے سو مجھے اپنے کام سے کام رکھنا چاہئے۔ البتہ میں نے دل میں سوچ لیا تھا کہ آئندہ میں اس کے ساتھ کسی پراجیکٹ پر کام نہیں کروں گی۔ نہ ہی اسے اسسٹ کروں گی۔۔۔۔ اور یہ بات میں نے سعد خان سے بھی کہہ دی تھی۔ اور وہ مسکرا دیے تھے۔

''او کے مس اوج! ایز یو وِش۔''

لیکن تب مجھے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ پراجیکٹ ختم ہونے سے پہلے ہی یہ شخص مجھے اپنا اسیر کر لے گا۔ جب ڈیڈی نے مجھے بلا کر سکندر علوی کے متعلق پوچھا۔ تب بھی میرے وہم و گمان تک میں نہیں تھا۔ کہ اس نے مجھے پروپوز کیا ہے اور ڈیڈی کی انویسٹی گیشن اس سلسلے میں ہے۔

''ڈیڈی! آپ سکندر کو جانتے ہیں؟'' مجھے حیرت ہوئی تھی۔

''جی بیٹا! میں اس سے مل چکا ہوں۔''

''تو پھر آپ اس کے متعلق کیا جاننا چاہتے ہیں؟''

''یونہی کہ کیسا ہے' کس طرح کا ہے۔''

''بہت ذہین ہے بلکہ جینئس کہہ لیں' لیکن اس کے مزاج کے متعلق کچھ پتا نہیں چلتا۔''

میں نے بہت صاف گوئی سے وہ سب کچھ جو میں اس کے متعلق سوچتی اور محسوس کرتی تھی کہہ دیا۔

اور میں نے محسوس کیا کہ ڈیڈی کچھ خاموش سے ہو کر سوچنے لگے ہیں۔

''آپ کا کیا خیال ہے بیٹا! کہ اس طرح کے مزاج کے شخص میں حالات کے بدلنے سے تبدیلی آ سکتی ہے؟''

کچھ دیر بعد انہوں نے پوچھا۔

''شاید۔'' میں کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ اس کے مزاج کے پیچھے اس کے گھریلو حالات ہیں۔ محبتوں کا بہت کم عمری میں چھن جانا اور سوتیلے رشتوں کا ناروا سلوک.......... شاید محبتیں....... سچی اور خالص محبتیں اس کا مزاج بدل دیں۔''

میں نے حیرت سے ڈیڈی کی طرف دیکھا۔

''آپ شاید بہت زیادہ جانتے ہیں سکندر کو۔ لیکن اس سے پہلے آپ نے کبھی ذکر نہیں کیا۔''

''اس سے پہلے میں اسے جانتا بھی نہیں تھا اوج بیٹے! میں پہلی بار کل شام ہی اس سے ملا ہوں۔ وہ اسد ملک کے ساتھ آیا تھا یہاں۔''

''اسد کے ساتھ یہاں۔ لیکن کیوں؟'' میں نے پھر پوچھا۔

''میں نے اسے بلایا تھا۔''

''آپ نے لیکن کیوں ڈیڈی؟''

مجھے ڈیڈی کی باتوں پر حیرت ہو رہی تھی۔

''دراصل۔'' ڈیڈی نے بہت غور سے مجھے دیکھا۔

''اس کا پروپوزل آیا ہے تمہارے لئے۔''

''نہیں۔'' مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ سکندر علوی نے مجھے پرپوز کیا ہے۔ امپاسبل' بھلا وہ مجھے کیسے پرپوز کر سکتا ہے۔ اس کے کسی رویے سے اس طرح کی کوئی بات ظاہر نہیں ہوتی تھی کہ وہ اپنے دل میں میرے لئے کوئی جذبہ رکھتا ہے۔ ایک لمحہ کے لئے میرے دل کی دھڑکن تیز ہوئی مگر دوسرے ہی لمحے میں نارمل ہو چکی تھی۔ ابھی کل شام ہی تو ہم تقریباً تین گھنٹے تک اکٹھے بیٹھے ڈسکشن کرتے رہے لیکن اس نے ایک بھی اس طرح کی کوئی بات نہیں کی تھی۔

''تمہارا کیا خیال ہے اوج! اس پروپوزل کے متعلق؟''

ڈیڈی کے ساتھ میری ہمیشہ سے بہت دوستی رہی تھی اور ہم ہر موضوع پر بے تکلفانہ بات کر لیا کرتے تھے لیکن پھر بھی ڈیڈی کے یکدم پوچھنے پر میں ایک لمحہ کو خاموش رہ گئی تھی۔

''بیٹا! تم سوچنا' مجھے اور تمہاری ممی کو سکندر بہت اچھا لگا ہے۔ جہاں تک اس کے اس پل پل بدلتے مزاج کی بات ہے تو شاید........ یہ اتنی بڑی خامی تو نہیں ہے۔''

ڈیڈی کے نزدیک یہ اتنی بڑی خامی نہ تھی۔ لیکن میں جتنا سوچتی' مجھے لگتا جیسے اس

کے ساتھ زندگی گزارنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ یہ شخص کھلتا نہیں۔ اس نے خود کو بہت سارے پردوں کے پیچھے چھپا رکھا ہے۔ میں نے اس کے ساتھ کام کے دوران جتنا وقت گذارا تھا میں نے اس کا ایک ایک لمحہ سوچا۔

بلاشبہ وہ بہت ہمدرد تھا۔

بہت سخی تھا۔ اسے پیسے سے محبت نہ تھی۔ اس کے کردار میں کوئی کمزوری نہ تھی۔ میں نے اسے کبھی کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتے نہیں دیکھا تھا۔

ہمارے آفس میں لڑکیاں بھی کام کرتی تھیں۔ جن میں جوان بھی تھیں اور خوبصورت بھی' میں نے اس کے رینک کے کئی لوگوں کو دیکھا تھا۔ اس سے عمر میں بڑے بھی تھے اور اس کے ہم عمر بھی' لڑکیوں کو دیکھتے ہی انکی آنکھوں میں ایک خاص چمک پیدا ہو جاتی تھی کبھی کبھار وہ رکیک مذاق بھی کر جاتے تھے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ورکنگ وومین جو گھر سے نکلتی ہیں تو ان کی کوئی عزتِ نفس نہیں ہوتی۔ لیکن سکندر میں یہ بات نہ تھی۔

وہ سب کی عزت کرتا تھا' تکریم کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اس کی نگاہوں میں غلاظت نہ تھی۔

پتا نہیں کیوں میرے اندر اس کی طرف سے ایک خدشہ تھا' خوف سا تھا۔ میں نے ڈیڈی کی آنکھوں اور لہجے سے اس کے لئے پسندیدگی محسوس کی تھی لیکن میں یہ بھی جانتی تھی کہ ڈیڈی یا ممی مجھ پر کبھی اپنی مرضی مسلط نہیں کریں گے۔

اس رات نیند مجھ سے روٹھ گئی تھی۔ میں ہاں یا نہ کے درمیان لٹک رہی تھی کبھی دل میں اس احساس سے دھڑکنیں خوشگوار ہو جاتیں کہ وہ شخص جو سب میں نمایاں اور منفرد ہے اس نے مجھے پرپوز کیا ہے اور کبھی اس کے مزاج کا تضاد مجھے سہا دیتا۔

''سکندر ایک مشکل شخص ہے ڈیڈی۔'' میں نے فیصلہ کر لیا اور ڈیڈی کو بتایا۔

''مثلاً.......؟'' ڈیڈی نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

''میں نے تجزیہ کیا ہے کہ سکندر کی ذات و شخصیت میں کوئی گنجل ہے وہ کبھی کبھی بہت سخت ہو جاتا ہے۔

''بیٹا! ممکن ہے! آج تک کسی نے اس کی ذات کے گنجل کو کھولنے کی کوشش ہی نہ کی ہو۔ اور کیا تم یہ کام نہیں کر سکتیں اوج۔''

''میں نے چونک کر ڈیڈی کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں التجا تھی۔ درخواست تھی۔

''دنیا میں کوئی انسان بھی پرفیکٹ نہیں ہوتا اوج! اور پھر جب سکندر میں اتنی بے شمار خوبیاں ہیں تو کیا اس کی اس ایک خامی کو اگنور نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ آج کل کے دور میں لڑکوں نے بے شمار علتیں پال رکھی ہوئی ہیں۔''

تب اچانک مجھ پر انکشاف ہوا کہ ڈیڈی چاہتے ہیں کہ میں ہاں کر دوں۔

''بیٹا! میں نے اس سے بہت دیر بات کی میں نے محسوس کیا کہ وہ اندر سے بہت بکھرا ہوا ہے۔ بہت ٹوٹا ہوا۔

میرا دل کہتا ہے اوج! تم اسے سنبھال لوگی۔ ایک بار پھر سوچ لو اگر دل میں کچھ گنجائش پاؤ تو.....؟''

میں نے ڈیڈی کی آنکھوں میں دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ یکدم مسرت سے ڈیڈی کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

مجھے یقین ہے اوج! کہ تم سکندر کے ساتھ ایک بہترین زندگی گزارو گی۔'' انہوں

ڈیڈی کو یقین تھا' گو میں بے یقین تھی پھر بھی میں **مسکرا دی۔ ڈیڈی** کا تجربہ بہرحال مجھ سے زیادہ تھا۔

یہ بندھن بھی کتنا خوبصورت' مقدس اور عجیب ہوتا ہے۔ **اس کے نام کی انگوٹھی** ہاتھوں میں ڈالتے ہی دل اس کے نام پر دھڑکنے لگا تھا۔ کام کرتے ہوئے **میں چوری چوری** اسے دیکھتی تو وہ اپنے کام میں مصروف ہوتا۔ وہی پہلی سی بے نیازی کے ساتھ' کسی **کام میں** خرابی ہوتی تو ڈانٹ بھی دیتا۔ اور میرے دل میں کہیں کچھ ٹوٹ سا جاتا لیکن پھر میں خود کو تسلی دے لیتی۔

''سکندر کو اپنے کام سے عشق ہے۔ سعد خان کہتے تھے کہ جب سکندر کوئی پراجیکٹ شروع کرتا ہے تو پھر خود کو اس میں گم کر دیتا ہے۔''

لیکن پھر بھی کبھی تو....... کبھی تو اس نے کچھ کہا ہوتا۔ کوئی خوبصورت جملہ' کوئی پیار بھری نظر۔ فارغ لمحات بھی تو ہوتے تھے۔ کئی بار ہم نے سائیٹ پر اکیلے بیٹھ کر کافی پی۔ لیکن سکندر نے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی' جیسے وہ یہ بندھن باندھ کر بھول گیا تھا کہ میرے اور اس کے درمیان کیا رشتہ ہے۔ میں نے شادی کے لئے پندرہ دن کی چھٹی لی تو سب ہی مس مارتھا کے کمرے میں اکٹھے ہو کر مجھے وش کر رہے تھے۔

''سچ بتاؤ اوج! اتنے روکھے بندے کو کیسے پٹایا۔''

مس مارتھا نے ہنس کر پوچھا۔

''نہیں.....میں نے تو نہیں.......'' میری نظریں اندر آتے سکندر پر پڑیں تو نروس ہو کر میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''مس اوج نے نہیں' سکندر نے انہیں پٹایا ہوگا۔'' ٹائپسٹ لڑکی فاخرہ نے جس کی پشت سکندر کی طرف تھی تبصرہ کیا۔

''حقیقت یہ ہے مس مارتھا! انہوں نے ہی مجھے پٹایا ہے۔''

سکندر کے ہونٹوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ تھی اور وہ شوخ نظروں سے مجھے دیکھ تھا۔

''کیسے؟'' فاخرہ نے پوچھا۔

''یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔'' وہ معصومیت سے کہتا ہوا اسد ملک کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''بے خبری میں ہی لٹ گئے۔''

اس نے بہت گہری نظروں سے مجھے دیکھا اور اس کی نظروں کی حدت سے میرے رخسار جل اٹھے اور پلکیں اٹھانا مشکل ہو گیا۔

''سکندر علوی! اگر آج سے اٹھارہ سال پہلے تم ملے ہوتے تو کہیں نہ جانے دیتی تمہیں سوئٹ بوائے۔''

مسز مارتھا ہنسیں۔

''بھئی، ہمیں تو جن کا گرفتار بننا تھا ان ہی کا بننا تھا۔ چاہے اٹھارہ سال پہلے، چاہے اب۔''

اس کی نظریں اب بھی میرے چہرے پر تھیں۔

والہانہ نظریں۔ وجود کے اندر اترتی ہوئی۔

''تم بہت لکی ہو اوج!''

مسز مارتھا نے رشک بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور مجھے لگا، میں واقعی دنیا کی خوش قسمت ترین عورت ہوں جسے سکندر جیسے شخص کا ساتھ ملا ہے۔

''کیا میں نہیں؟'' وہ مسز مارتھا کے سامنے جھکتا پوچھ رہا تھا۔

''تم بھی شریر لڑکے۔''

''ہائے اوئے یہ رش کس سلسلے میں ہے۔ کیا مسز مارتھا کافی پلوا رہی ہیں؟''

اس نے پوچھا تو سب اسے بتانے لگے کہ آج میں شادی کے لئے چھٹی پر جا رہی

ہوں۔

''چھٹی پر جا رہی ہیں اور مجھے اسسٹ کون کرے گا۔''

''میں۔'' اسد ملک نے جواب دیا۔

''جی نہیں، تم چھٹیاں بہت کرتے ہو بھگوڑے۔''

''اچھا ڈی سوزا کر لے گا۔''

''جی نہیں۔'' وہ خواہ مخواہ پھیل رہا تھا اور شوخ نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا.......

اس روز اس کا رویہ دیکھ کر میں نے سوچا تھا شاید وہ اپنی ذات کے خول سے باہر آ رہا ہے اور اس کے ساتھ زندگی بے حد خوبصورت ہو گی۔ ہلکی پھلکی اور مسرتوں سے بھری۔

اس روز اس نے مجھے آفر کی تھی چونکہ وہ بھی گھر جا رہا ہے۔ لہٰذا مجھے ڈراپ کر دے گا۔

منگنی کے بعد پہلی بار اس کا یہ التفات مجھے پزل کیے دے رہا تھا۔

''اوج!'' راستے میں اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''شادی کی ساری شاپنگ بھابی اور اسد بھائی ہی کر رہے ہیں۔ مجھے اس کا کچھ تجربہ نہیں ہے۔ میں نے بھابی سے کہا تھا کہ وہ آپ سے بھی مشورہ کر لیں۔ پھر بھی آپ اپنی پسند سے کچھ لینا چاہیں تو۔''

اس نے ایک بڑی رقم کا چیک مجھے دیا۔ میں نے انکار کیا تو اس نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

''پلیز اوج! انکار مت کیجئے۔ فی الحال میں فلیٹ میں رہتا ہوں، وہ بھی کرائے ہے لیکن جلد ہی آپ کے آنے کے بعد میں اپنا گھر لے لوں گا۔''

پہلی بار اپنے حوالے سے اس نے یہ بات کی تھی، پھر ذرا سا مسکرایا تھا۔

'اوج! میں کچھ کھردرا سا بندہ ہوں۔ شاید بدمزاج بھی....... پھر بھی آپ نے

میرا پروپوزل ٹھکرایا نہیں' اس کے لئے کیا شکریہ بولوں۔''

میں خاموش ہی رہی' بھلا کیا کہتی۔لیکن رخساروں پر شفق اتر آئی تھی۔

''بہرحال' اب تو جیسا بھی ہوں' آپ قبول کر چکی ہیں اور امید ہے اپنی ریشم رفاقتوں سے میرے گھر درے پن کا بھرم رکھ لیں گی۔''

اور تب میں نے سوچا تھا کہ میں سکندر کی زندگی کے ورق ورق سے وہ داستانِ الم کھرچ دوں گی۔جس نے سکندر کو یوں کرخت بنا دیا ہے۔ڈیڈی صحیح کہتے ہیں کہ سکندر اندر سے بہت نرم دل ہے۔

رخصتی سے پہلے میں نے ڈیڈی سے کہا تھا۔

''ڈیڈی! آپ میرے لئے پریشان مت ہوئیے گا۔سکندر ایک بہترین انسان ہے اور اس کی رفاقت میرے لئے باعثِ فخر۔ڈیڈی! میں اسے مزید بکھرنے نہیں دوں گی۔''

شاید یہ غلط تھا...... مجھے لگا' میرے ساتھ نے اسے اور بکھیر دیا ہے۔اس نے اپنے گرد نفرت اور اجنبیت کی دیواریں کھڑی کر لی ہیں۔شاید اسے مجھ سے محبت نہیں تھی۔رفاقتیں محبتوں کو جنم دیتی ہیں' لیکن اسے مجھ سے محبت نہ ہو سکی۔میں نے اس سے کبھی گلہ نہیں کیا۔محبت تو خودبخود کسی دل میں جنم لیتی ہے اور کسی دل پر جبر نہیں کیا جا سکتا لیکن مجھے اس سے محبت ہو گئی تھی۔بہت شدید اور گہری محبت میں نے جو پہلے اس سے شادی کرنے سے انکار کیا تھا۔اب اس کی زندگی میں شامل ہونے کے بعد مجھے یوں لگنے لگا تھا کہ وہی ایک شخص میری زندگی کا حاصل ہے۔اور اگر وہ نہ ہوتا تو اس کے بغیر زندگی بے معنی اور بیکار تھی۔

میں بہت زیادہ خوبصورت نہ تھی لیکن سب ہی کہتے تھے کہ میں بہت پرکشش اور دلکش ہوں۔اور عروسی لباس میں تو میں خود اپنے آپ کو دیکھ کر ایک لمحہ کو ششدر رہ گئی تھی۔کیا یہ میں ہوں۔میں نے بہت حیرت سے خود سے پوچھا تھا۔میری کزنز مجھ سے مذاق کر رہی تھیں

مجھے چھیڑ رہی تھیں اور میرے کانوں میں نہ جانے کیا کیا سرگوشیاں کر رہی تھیں۔لیکن سکندر نے بس ایک نظر مجھے دیکھا تھا۔ایک لمحہ کو مجھے اس کی آنکھوں میں ستائش نظر آئی تھی۔لیکن دوسرے ہی لمحے وہ نارمل سا مجھ سے اس طرح باتیں کر رہا تھا جیسے ہم آفس میں بیٹھے ہوں۔

''ویسے تم آج بہت دلکش لگ رہی ہو اوج.......! بالکل مختلف۔ایک لمحہ کو تو میں تمہیں پہچان ہی نہیں سکا۔''

مجھے رونمائی میں لاکٹ دیتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جذبوں کی چمک نظر آنے لگی تھی۔میں شرما گئی۔تو اس کے ہونٹوں پر دلکش سی مسکراہٹ آ کر ٹھہر گئی۔

''اوج! تم مجھ سے شادی کر کے خوش ہو نا۔''

میں نے سر جھکا دیا۔لیکن میرے چہرے پر پھیلتے خوشی کے رنگ چھپ نہ سکے۔

''پتا نہیں' میں تمہیں خوش رکھ سکوں گا یا نہیں۔'' اس نے جیسے اپنے آپ سے کہا تھا۔

''کیوں؟'' میں نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

''اوج! میں...... مجھے پتا ہی نہیں کہ کسی کو خوش کیسے رکھتے ہیں کیونکہ مجھے کبھی کسی نے خوش نہیں رکھا۔''

''میں...... میں آپ کو بتاؤں گی سکندر! کہ خوشی کیا ہوتی ہے..... ہم دونوں مل کر ایک خوش کن زندگی کا آغاز کریں گے۔''

میں نے دل کی گہرائیوں سے کہا تھا اور اس سمے میں نے اپنے دل میں سکندر کے لئے بہت انوکھی سی محبت محسوس کی تھی...... مجھے لگا تھا جیسے بظاہر درشت دکھنے والا سکندر اندر سے بہت بکھرا اور ٹوٹا ہوا ہے۔اور اس سمے میں نے اپنے دل میں عہد کیا تھا کہ میں سکندر سے اتنی محبت کروں گی کہ وہ اپنی ساری محرومیاں بھول جائے گا۔

لیکن اس کے زخموں پر مرہم رکھتے رکھتے میرے اپنے ہاتھ زخمی ہو گئے۔اس کی

محرومیاں دور کرتے کرتے میں خود بہت ساری محبتوں سے محروم ہو گئی۔

اس نے جو چاہا میں نے کیا.........

اس نے چاہا' کہ میں جاب چھوڑ دوں۔

میں نے جاب چھوڑ دی۔

اس نے کہا میں بھاگ بھاگ کر میکے نہ جایا کروں۔

میں نے میکے جانا چھوڑ دیا۔

اس نے کہا دوستوں سے نہ ملوں۔

میں نے کہا ٹھیک ہے۔

دل میں ایک امید تھی کہ میری یہ قربانیاں رنگ لائیں گی۔

شاید ایک روز اپنی ذات کے حصار سے باہر نکل آئے ایک روز وہ میری محبتوں اور خدمتوں کا اعتراف کرلے لیکن ایسا ہوا نہیں۔ محبت سے بات کرتے کرتے وہ یک دم درشت ہو جاتا۔

شاید وہ اپنی ذات کا حصار توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ شاید وہ اپنے خول سے باہر آتے ڈرتا تھا۔ اس نے کبھی مجھ سے اپنا ماضی شیئر نہیں کیا۔

تب میں نے اپنے ماضی کو دہرانا شروع کر دیا۔ کہ شاید کبھی وہ بھی اپنے ماضی کا ذکر کرے۔ یونہی۔ ٹی۔ وی دیکھتے ہوئے۔ کھانے کی میز پر بیڈ روم میں' میں کوئی نہ کوئی اپنے بچپن کی بات چھیڑ دیتی۔ شروع میں ایک دو دن اس نے دلچسپی سے میری بات سنی......

لیکن پھر میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے بچپن کی باتوں سے چڑتا ہے۔ بلا وجہ کا غصہ۔

کبھی کوئی پلیٹ اٹھا کر پٹخ دی اور کبھی کچھ........ میں حیران ہوتی کہ وہ اس طرح کیوں کرتا ہے۔ تب ہی ایک روز وہ پھٹ پڑا۔

''آخر تم مجھ پر کیا ثابت کرنا چاہتی ہو اوج! یہ کہ تمہارا بچپن بہت خوبصورت تھا۔ اور اب زندگی تمہارے لئے اتنی خوبصورت نہیں ہے۔''

''نہیں ایسا تو نہیں سکندر.......! ہر عمر کے اپنے تقاضے اور اپنا حسن ہوتا ہے۔ میرا بچپن' میرا لڑکپن' میری جوانی سب ہی خوبصورت ہے....... اور یہ لمحے جو اب تمہاری رفاقت میں گذر رہے ہیں' وہ تو زندگی کا حاصل ہیں' سب سے خوبصورت ہیں۔''

''تم جھوٹ بولتی ہو اوج!'' اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔

''نہیں' بھلا اس میں جھوٹ کی کیا بات ہے۔ تم ایک اسمارٹ' پڑھے لکھے باروزگار شخص ہو۔ اس کے علاوہ ایک عورت کو کیا چاہئے ہوتا ہے؟''

میں نے آہستگی سے کہا تو اس کی آنکھوں میں نرم سا تاثر ابھرا۔

''میں تو بچپن کی باتیں اس لئے کرتی ہوں کہ آدمی اپنا بچپن کبھی نہیں بھولتا۔ تمہارا بچپن بھی تو ایسا ہی ہوگا۔''

''نہیں تھا میرا بچپن ایسا۔'' یکدم ہی اس کی آنکھوں کا وہ نرم تاثر غائب ہو گیا اور وہاں عجیب سی درشتی جھانکنے لگی وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ٹی۔ وی روم سے باہر نکل گیا۔

شاید اس کے بچپن سے کوئی خوبصورت یاد وابستہ نہ تھی لیکن دکھ ہی سہی....... وہی شیئر کر لیتا لیکن وہ اپنے حوالے سے کبھی کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ جیلس ہوتا ہے شاید اس کے ذہن میں خیال آتا ہو کہ اس کا بچپن اتنا اچھا کیوں نہیں تھا۔ تب میں نے اپنے بچپن اور لڑکپن کی باتیں کرنا چھوڑ دیں۔ میں اسے خوش دیکھنا چاہتی تھی' کیونکہ میں اس سے محبت کرتی تھی۔ کبھی کبھی مجھے خود پر حیرت ہوتی کہ میں اوج کمال' سکندر علوی سے شدید محبت کرنے لگی ہوں' اتنی شدید کہ ذرا اسے دیر ہو جاتی تو بے چین ہو جاتی۔ آفس فون کرتی اور جب تک وہ گھر نہ آجاتا۔ جلے پاؤں کی بلی کی طرح سارے گھر میں

چکراتی پھرتی۔شاید یہ محبت اس رشتے کی وجہ سے خود بخود دل میں اتر آئی تھی جو میرے اور اس کے درمیان تھا۔لیکن اس مقدس رشتے نے اس کے دل میں میرے لئے محبت بیدار نہ کی تھی۔ کبھی کبھی مجھے لگتا جیسے وہ مجھے چاہتا ہے مجھ سے محبت کرتا ہے۔اس کی والہانہ نظریں اس کی وارفتگی......اس کے خوبصورت جملے۔

لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی نظریں بدل جاتیں۔

خوبصورت جملوں کی جگہ اس کی زبان پر کانٹے اگ آتے۔وہ مجھے ناخوش کر کے خوش ہوتا۔مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کے کونوں پر تھرتھراتی۔

''کیا وہ کوئی نفسیاتی مریض ہے؟''ایک بار میں نے سوچا تھا۔

♥ ♥ ♥ ♥

اس روز ہم اسد ملک کے ہاں سے ڈنر کر کے لوٹے تھے۔اسد کے بیٹے کی برتھ ڈے تھی اور انہوں نے ہمیں ڈنر پر انوائیٹ کیا تھا۔اس روز میں نے سیاہ ساڑھی باندھی تھی جس کے بارڈر پر سنہری ستاروں کا جال سا بنا تھا اور اسد ملک کی بیوی نے کہا تھا کہ میں آج غضب ڈھا رہی ہوں۔

میں نے بلیک اسٹون کے ہلکے سے ٹاپس اور نازک سی مالا پہن رکھی تھی اور بلیک ہی کانچ کی چوڑیاں پہنی تھیں۔پتا نہیں کیوں مجھے بچپن سے ہی سونے کے مقابلے میں کانچ کا چوڑیاں پسند تھیں۔راستے میں ڈرائیو کرتے ہوئے کئی بار سکندر نے میری طرف دیکھا اور مسکرایا' اس کی آنکھوں میں واضح ستائش تھی۔اور پھر اس نے ایک جگہ گاڑی روک کر پھول بیچنے والے لڑکے سے پھول خریدتے ہوئے میری طرف مسکرا کر دیکھا تھا۔

''آج بہت پیاری لگ رہی ہو سوچا ان کلائیوں میں پھول سج کر تمہیں اور دلکش بنا

دیں گے۔'' اور پھر اپنے ہاتھوں سے میری کلائیوں میں گجرے پہناتے ہوئے وہ ٹھٹک کر رک گیا تھا۔

''ایک بار حمید اللہ علوی نے افزا علوی کے لئے گجرے خریدے تھے اور........''

وہ جیسے خواب کے سے عالم میں بولا تھا' اور اس نے اپنے ہاتھ میری کلائیوں سے ہٹا لیے۔ میں بہت دھیان سے اسے سن رہی تھی۔ شاید آج وہ لمحہ ہے کہ جب وہ اپنے متعلق کچھ بتانے لگا ہے۔ پتا نہیں یہ افزا علوی اور حمید اللہ علوی کون ہیں۔ میں نے سوچا لیکن وہ پھر اپنے خول میں سمٹ گیا اور اپنی ذات کے گرد وہی دیواریں کھڑی کر لیں اور ہونٹ بھینچ لئے۔ مجھے لگا' جیسے اس کی آنکھیں خون رنگ ہو رہی ہوں۔ میں کتنے ہی لمحے منتظر رہی کہ شاید وہ کچھ بولے لیکن وہ خاموشی سے ہونٹ بھینچے ڈرائیو کرتا رہا۔ گاڑی جب گھر والی سڑک پر مڑی تو میں نے پوچھا۔

''سکندر! کیا۔ ہم گھر جا رہے ہیں؟''

''ہاں!''

''مگر تم نے تو کہا تھا لمبی ڈرائیو پر جائیں گے۔ اور.......''

''جھک ماری تھی' جھوٹ بولا تھا۔'' وہ یکدم مجھ پر الٹ پڑا۔

''تمہارا دل چاہ رہا ہے تو چلی جاؤ اکیلی۔''

اور میں ششدر سی اسے دیکھتی رہی....... اور میرے آنسو اندر ہی اندر میرے دل پر گرنے لگے' ابھی چند لمحے پہلے اس کی آنکھوں میں کتنے رنگ تھے۔ کتنی جدت تھی۔ کیسی محبت تھی' کاش لمحے وہیں کہیں ٹھہر جاتے اور میں ہمیشہ ان جذبے لٹاتی آنکھوں کو خود پر نثار ہوتے دیکھتی رہی اور یہ کوئی ایک بار کی تو بات نہ تھی کئی بار ایسا ہوا تھا کہ مجھے لگا جیسے مجھے میری ریاضتوں کی ثمر مل گیا ہو لیکن دوسرے ہی لمحے میں پھر اس جگہ پر پہنچ جاتی جہاں سے میرا سفر شروع ہوا تھا۔

♥ ♥ ♥ ♥

ایک روز وہ بہت خوش خوش گھر آیا تھا۔

''آوج!.......اوج! جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ آج ہم ڈنر باہر کریں گے اور میں تمہیں ایک سرپرائز دوں گا۔''

''کیا بات ہے' بہت خوش لگ رہے ہو۔''

''خوش تو ہوں۔'' وہ مسکرایا۔ مسکراہٹ اس کے چہرے پر کتنی بھلی لگتی تھی۔ میں کتنی ہی دیر اس کے چہرے کو تکتی رہی۔

''کیا نظر لگانے کا ارادہ ہے؟'' میں جھینپ گئی اور میں نے نظریں جھکا لیں۔

''اپنا اچھا سا ڈریس پہن لو۔''

میرے اندر جیسے پھول کھلنے اور چٹکنے لگے۔ میں فوراً ہی تیار ہونے چل دی۔ اور جب تیار ہو کر آئی تو وہ خود بھی سیاہ ڈنر سوٹ میں تیار کھڑا تھا۔

''گڈ!'' اس نے ایک ستائشی نظر مجھ پر ڈالی۔ ''آج کے دن تمہیں اتنا ہی خوبصورت نظر آنا چاہیے' جتنا آ رہی ہو۔''

''مگر آج کے دن کیا ہے؟'' اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے میں نے پوچھا تو وہ مسکرا دیا۔

اور پھر کچھ دیر بعد ہی مجھے پتا چل گیا کہ آج میرا برتھ ڈے تھا اور مجھے یاد تک نہ تھا۔ سکندر کی ذات نے مجھے اس طرح الجھایا تھا کہ مجھے اپنا برتھ ڈے بھی یاد نہ رہا تھا۔ حالانکہ شادی سے پہلے میں دو تین دن پہلے ہی شور مچانا شروع کر دیتی تھی کہ میری برتھ ڈے آ رہی ہے' لہٰذا سب میرے لئے گفٹ خرید لیں اور اب میں ہوٹل میں سجی سجائی ٹیبل کے گرد عجیب لیکن خوبصورت احساسات میں گھری بیٹھی تھی' جب سکندر نے جھک کر سرگوشی کی۔

''ہیپی برتھ ڈے اوج!'' اس کی آنکھوں میں جگنو سے دمک رہے تھے۔

''تھینک یو سکندر!'' شدتِ جذبات سے میری آواز بھر آ گئی۔

''کیا گفٹ لوگی؟'' وہ بدستور تھوڑا سا میری طرف جھکا تھا۔

''آپ کو یہ دن یاد رہا۔ آپ نے اسے سیلیبریٹ کیا۔ اور یہ خوبصورت پھول۔''

میں نے تیبل پر پڑے خوبصورت بکے کی طرف اشارا کیا۔

''اس سے بڑھ کر اور کیا گفٹ ہو سکتا ہے۔''

''کیا خبر کوئی ہو۔'' وہ مسکرا رہا تھا۔

پھر ہم دونوں نے ایک ساتھ پھونک مار کر موم بتی بجھائی' یہ میری ازدواجی زندگی کا حسین ترین دن تھا۔ ہم ڈنر کر کے جب باہر نکلے تو سکندر کے ہاتھ میں میرا ہاتھ تھا۔ اس کی گرم جوش گرفت سے میرے رگ و پے میں بجلیاں دوڑ رہی تھیں۔ اور اس سمے اس کے ساتھ چلتے چلتے میں نے تاعمر اس کی رفاقت میں یونہی چلتے رہنے کی آرزو کی۔

اس روز سکندر مجھے ایک قطعی بدلا ہوا شخص لگ رہا تھا۔ قدرے شوخ اور کھلنڈرا سا۔

''کیا اب ہم گھر جا رہے ہیں''۔

میں نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''مگر یہ راستہ گھر کی طرف تو نہیں جاتا۔''

''کیا خبر گھر کی طرف ہی جاتا ہو۔'' اس نے بے حد شوخ نظروں سے مجھے دیکھا' اور میں سمجھ نہ سکی کہ اس میں کیا اسرار ہے اور جب ایک خوبصورت گھر کے سیاہ گیٹ میں لگے ہوئے لاک کو سکندر نے کھولا تب بھی مجھے خبر نہ تھی بلکہ گمان تک نہ تھا کہ یہ گھر سکندر کا ہے۔........

''کیسا ہے یہ گھر؟'' سکندر نے مجھے سارا گھر دکھایا۔

''بہت خوبصورت۔'' میں نے تعریف کی۔

''کیا آپ فلیٹ چھوڑنے کا ارادہ کر چکے ہیں اور ہم لوگ اب یہاں شفٹ ہوں گے۔''

میرے لہجے میں سچی خوشی تھی۔ مجھے فلیٹ پسند نہیں رہے کبھی بھی' وہاں مجھے گھٹن ہوتی ہے۔ ہمیشہ سے مجھے بڑے اور کھلے گھر پسند ہیں۔ خوبصورت لان ہو جس میں پھول لہلہاتے ہوں۔

''یہ گھر۔'' اس نے پاکٹ سے چابی نکال کر مجھے دی۔ ''تمہارا ہے........ تمہارا برتھ ڈے گفٹ۔''

اس نے ہاتھ میں پکڑا براؤن لفافہ میری طرف بڑھایا۔

''یہ گھر میں نے تمہارے نام سے خریدا ہے۔ کچھ کارروائی باقی ہے اسے کل مکمل کر لیں گے۔'' میں ساکت کھڑی تھی۔

''یار........ لے لو اور یقین کر لو۔ یہ گھر تمہارا ہے۔ اب کل سے ادھر شفٹ ہو جائیں گے۔ ایک بار تم نے کہا تھا کہ تمہیں فلیٹوں کی زندگی پسند نہیں ہے۔'' اور اسے میری بات

یاد تھی، جبکہ میں سمجھتی تھی کہ اس نے کبھی دھیان سے مجھے نہیں سنا۔

''میں جب چھوٹا تھا تو ہر روز سونے سے پہلے اپنے دل میں عہد کرتا تھا کہ جب بڑا ہوں گا تو افزا علوی کے لئے ایک بڑا سارا گھر خریدوں گا۔'' وہ جیسے کہیں ماضی میں جھانک رہا تھا۔

اور پھر........

یکایک وہ چونکا جیسے خواب سے جاگا ہو اور پھر پہلے کی طرح اس نے اپنی ذات کے دریچے بند کر دیے۔ پتا نہیں کیوں وہ خود کو چھپائے رکھنا چاہتا تھا۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ یکایک اس کی آنکھوں کی چمک بجھ گئی تھی۔ اور اس کے لہجے میں جو خوشی کچھ دیر پہلے کھنک رہی تھی وہ مر گئی تھی۔ وہ کچھ کھو سا گیا تھا۔

''سکندر!'' میں نے اس کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔

''تھینک یو سکندر! لیکن تم یہ کچھ کہتے کہتے رک کیوں جاتے ہو........ میں تمہاری دوست ہوں سکندر! صرف بیوی نہیں..... تم کبھی تو اپنا دل کھول کر میرے سامنے رکھ دو...... یقین کرو سکندر! میں تمہارے دل میں چھپے سارے کانٹے چن لوں گی۔ سب دکھ لے لوں گی۔''

''کون سے دکھ؟ کون سے کانٹے اوج؟ تم کیا سمجھتی ہو کہ دنیا میں صرف واحد تم ہی خوش قسمت ہو۔ تم نے ہی خوشیوں کے پھول چنے ہیں۔ باقی سب کا دامن کانٹوں سے بھرا ہے۔''

پل کے پل میں اس کی آنکھوں میں تکدر کے بادل اتر آئے تھے لہجے میں درشتی تھی۔ اور پیشانی پر بل پڑ گئے تھے اور اس رات واپس آتے ہوئے مجھے ایسی ایسی باتیں کہی تھیں کہ میں ساری رات روتی رہی تھی۔ آخر خوشی مجھے کیوں راس نہیں آتی تھی۔

کیا صرف چند لمحوں کی مسرت کی قیمت ساری رات بہنے والے آنسو تھے۔

صبح اٹھی تو میرا سر بھاری ہو رہا تھا اور آنکھیں جل رہی تھیں۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو قریب ہی سے اس کی نرم آواز سنائی دی۔

''لیٹی رہو اوج! غالباً تمہارے سر میں درد ہے۔

میں نے ناشتہ بنا لیا اور تمہارے لئے چائے دم کر کے رکھ دی ہے۔''

میں نے ذرا سا رخ موڑ کر دیکھا۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا بال بنا رہا تھا اور قریب ہی سائیڈ ٹیبل پر چائے کا تھرموس پڑا تھا۔ اس کی شخصیت کا یہ تضاد مجھے پاگل کیے دے رہا تھا۔ میرا جی چاہا میں چیخیں مار مار کر رونے لگوں۔ لیکن میں آنکھیں بھینچے چپ چاپ لیٹی رہی۔

زندگی کا سفر کتنا مشکل تھا۔ میں ہمت ہارنے لگتی تو ڈیڈی آنکھوں ہی آنکھوں میں ہمت بڑھاتے۔ نئے گھر میں شفٹ ہونے کی خوشی میں سکندر نے سب کو دعوت دی۔ اس روز آفس سے بھی سب ہی لوگ آئے تھے۔ اتنے سارے دنوں بعد میں سب سے ملی تھی لیکن پھر بھی میرے اندر کی اداسی ڈیڈی سے چھپی نہ رہ سکی تھی۔

''کیا بات ہے بیٹا؟''

انہوں نے بہت آہستگی سے مجھ سے اس وقت آ کر پوچھا جب میں کچن میں چائے کا کہنے آئی تھی۔

''کچھ نہیں ڈیڈی!'' میں نے مسکرانا چاہا تھا لیکن پتا نہیں کیوں پلکیں نم ہو گئی تھیں۔

''کیا سکندر سے کوئی شکایت ہے؟''

ان کی آنکھوں میں یکدم تشویش نظر آنے لگی۔

ڈیڈی! میں ابھی تک سکندر کو سمجھ نہیں پا رہی ہوں۔''

''ہمت ہار گئی ہوں۔ تم تو ہر چیلنج کو قبول کر لیتی تھیں۔''

وہ کچھ پریشان سے تھے لیکن مجھے حوصلہ دے رہے تھے۔

''سکندر میرے لئے چیلنج نہیں ہے میرا شوہر ہے۔ مجھے صرف اسے ہرانا تو نہیں ہے۔ مجھے تو اس کی محبت کی ضرورت ہے۔ ایک پل میں وہ محبت ہی محبت دیتا ہے اور دوسرے پل نفرت ہی نفرت۔ اس کے ساتھ کیا پرابلم ہے میں سمجھ نہیں پا رہی ہوں۔ اس نے اپنی ذات کے سارے دریچے بند کر رکھے ہیں۔''

''کہیں تو کوئی روزن ہوگا۔ جس سے اس کے اندر جھانک سکو۔'' ڈیڈی بالکل دوستانہ انداز میں بات کر رہے تھے۔

''کہیں کوئی روزن نہیں ہے ڈیڈی! کبھی کہیں کوئی روزن دکھائی بھی دیتا ہے تو وہ اسے فوراً بند کر دیتا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے جیسے اس کا ماضی۔۔۔؟''

''نہیں۔'' میری بات سمجھ کر ڈیڈی نے مجھے ٹوک دیا۔ ''وہ شریف ماں باپ کا بیٹا ہے۔ میں اس کے والدین کو جانتا ہوں شاید میں نے تمہیں بتایا تھا پہلے بھی۔''

''پتا نہیں شاید بتایا ہو' لیکن آپ کیسے جانتے ہیں۔''

''میرا تعلق اسی شہر سے ہے جہاں کا سکندر ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ والدین کی وفات کے بعد سوتیلے بہن بھائیوں کے سلوک نے اسے ایسا کر دیا ہے تم اپنی محبتوں سے اس کو بدل دو۔''

اور میں ایک نئے سرے سے ہمت باندھ کر اس کے ساتھ چلنے کی کوشش کرنے لگی۔

♥ ♥ ♥ ♥

ان دنوں بلال باہر سے اپنی تعلیم مکمل کر کے آیا ہوا تھا........ اور ممی چاہتی تھیں کہ اس کی شادی کر دی جائے۔ بلال میرا سگا بھائی نہیں ہے۔

لیکن اس نے سگے بھائیوں کی طرح ہی چاہا ہے مجھے اور سگی بہنوں کی طرح میرے لاڈ اٹھائے ہیں۔ اسکول کی عمر تک تو مجھے پتا بھی نہیں تھا کہ بلال میرا ماموں زاد ہے جسے ممی نے بچپن میں ہی لے لیا تھا۔ ہم نے ایک ہی گھر میں سگے بہن بھائیوں کی طرح پرورش پائی ہے۔ وہ اتنے سالوں بعد آیا تھا۔ میری شادی بھی اس کی عدم موجودگی میں ہوگئی تھی۔ وہ میرا دوستوں جیسا بھائی تھا' سو میرا جی چاہتا تھا کہ میں ہر روز ہی اس سے ملنے جاؤں' لیکن مجھے پتا تھا کہ سکندر کو یہ پسند نہ آئے گا لیکن میں نہ جاتی تو وہ خود چلا آتا۔ مگر سکندر کو اس کا آنا بھی پسند نہ تھا۔ وہ اس کے آنے پر چڑتا۔ طنز کرتا اور مجھے ڈیڈی کے گھر ہی چلے جانے کے مشورے دیتا اور میری بے بسی پر محظوظ ہوتا۔ بلال بچوں کے لئے کھلونے اور بچوں کے استعمال کی گئی

چیزیں لایا تھا میرے اور سکندر کے گفٹ کے علاوہ۔

''یار! میں نے تو سوچا تھا کہ اب تک کوئی چچوں بچوں آ چکا ہوگا اور تم اسے میری گود میں دیتے ہوئے کہوگی۔''یہ تمہارے ماموں جان ہیں۔''

اور جب اپنے گفٹ دکھاتے ہوئے میں نے بلال کی یہ بات سکندر کو بتائی تو اس کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا۔

''نہیں ضرورت ہمیں کسی 'چچوں پیچوں' کی۔''

''کیوں ضرورت نہیں سکندر! بچے تو زندگی کا حسن ہوتے ہیں۔''

''ہوتے ہوں گے حسن۔'' اس کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔''لیکن مجھے اس حسن کو دنیا کی ٹھوکروں میں نہیں چھوڑنا۔ سن لیا تم نے' یہ خواہش اپنے دل سے نکال دو۔ تم چاہتی ہو کہ میں مرجاؤں اور میرے بعد تم بھی افزا علوی کی طرح اسے چھوڑ کر چل دو..... نہیں ہرگز نہیں۔''

میرے دل میں جیسے اس نے بھالا مار دیا ہو۔ پھر بھی میں نے ضبط کیا۔

''سکندر!'' میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔

''میں اکلوتی تھی' تم بھی اکلوتے ہو۔ میں نے تو سوچا تھا۔ ہمارے ڈھیر سارے بچے ہوں گے۔''

''شٹ!'' اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔''ہمارے ڈھیر سارے تو کیا ایک بچہ بھی نہیں ہوگا۔''

اور مجھے لگا کہ جیسے آج سے بڑھ کر سخت اور تکلیف دہ بات سکندر نے کبھی نہ کی تھی اور یہ افزا علوی پتا نہیں کون تھی۔ میرے اندر شک کا کانٹا اگ آیا۔ آج تیسری بار اس نے یہ نام لیا تھا۔

''یہ افزا علوی کون ہے سکندر۔؟''

میں نے دل پر ضبط کے پہرے بٹھاتے ہوئے پوچھا۔ مگر وہ غصے سے مجھے گھورتا ہوا

باہر نکل گیا۔ جیسے وہ مجھے کبھی کچھ نہ بتائے گا۔ عورت سب کچھ برداشت کرسکتی ہے' ہر ظلم لیکن اسے اولاد سے محروم کر دیا جائے۔ وہ یہ برداشت نہیں کرسکتی۔ میں سمجھتی تھی کہ اگر ابھی تک میری اولاد نہیں ہوئی تو شاید خدا کی مصلحت ہے ابھی میری شادی کو بہت زیادہ عرصہ تو نہیں ہوا تھا کہ میں مایوس ہو جاتی لیکن یہ جان کر کہ سکندر مجھے دانستہ اس خوشی سے محروم رکھ رہا ہے میرا دل خون کے آنسو روتا لیکن میں نے پھر بھی صبر کیا اور کوشش کرتی رہی کہ وہ بند دریچے کھول دے اور اپنی ذات کے اسرار ظاہر کردے لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ ایک روز اس نے جو کہا اس نے مجھے ہرا دیا۔

اس روز بلال آیا ہوا تھا...... دراصل وہ کسی لڑکی کو پسند کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ ممی ڈیڈی اس کی شادی اس سے ہی کریں لیکن خود سے ان سے کہہ نہیں پا رہا تھا اور ممی نے غالباً کوئی لڑکی اس کے لئے پسند کرلی تھی اور اب وہ چاہتا تھا کہ میں اس کی پسند سے ممی کو آگاہ کر دوں۔

پتا نہیں بلال کو دیکھ کر سکندر کو غصہ کیوں آ جاتا تھا۔ مگر اس روز تو اس نے حد ہی کر دی اور ایسی ایسی باتیں کیں کہ میں کتنی ہی دیر تک ساکت بیٹھی رہی نہ جانے کتنی دیر بعد میرے ساکت وجود میں جنبش ہوئی میں اٹھی اور چند کپڑے بیگ میں ڈال کر جانے کے لئے کمرے سے نکلی۔ میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ اس سے بڑھ کر اور میری تذلیل کیا ہوسکتی تھی۔ وہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا تھا شاید۔

اس کے پاس سے گزرتے ہوئے میرے دل میں شدت سے خواہش پیدا ہوئی تھی کہ وہ میرے ہاتھ سے بیگ چھین لے اور ہمیشہ کی طرح سوری کرلے۔ اس کی عادت تھی کہ جب ہرٹ کرتا تو غیر ارادی طور پر پھر اس کی تلافی کرنے کی کوشش کرتا۔ لیکن آج اس نے مجھے روکا نہیں اور میں اپنے گھر چلی آئی...... ممی' ڈیڈی اور بلال مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔

"تمہیں تو شام کو آنا تھا اوج؟" بلال نے پوچھا۔

"بس میں ابھی آ گئی۔"

"اور سکندر کہاں ہے؟" ڈیڈی گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

"ڈیڈی!"

میرا ضبط جواب دے گیا اور میں ان کے سینے سے جا لگی۔

"ڈیڈی!

میں تھک گئی ہوں بہت زیادہ۔ سکندر نے جو حصار اپنے گرد کھینچ رکھا ہے، میں شاید کبھی بھی وہ حصار توڑ نہیں سکتی۔ وہ بظاہر نارمل لگتا ہے، لیکن وہ نارمل ہے نہیں، وہ کسی کو تکلیف میں دیکھ کر محظوظ ہوتا ہے۔ اسے دوسروں کا صبر اور بے بسی خوش کرتی ہے۔" میں نے روتے ہوئے ہر بات ڈیڈی سے کہہ دی۔ ڈیڈی چپ سے ہو گئے تھے۔

"سوری بیٹا! شاید مجھے سکندر کو سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ تم ریلیکس ہو جاؤ۔ میں سکندر سے بات کرتا ہوں۔"

"نہیں، آپ سکندر سے بات نہیں کریں گے۔"

میں اس وقت بہت غصہ میں تھی۔ "مجھے اب سکندر کے پاس واپس نہیں جانا۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں۔"

"اوکے بیٹا! ابھی تم غصے میں ہو بعد میں بات کر لیں گے انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ڈیڈی نے میرے کندھے تھپتھپائے۔ وہ جانے کیا سوچ رہے تھے لیکن میں نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ مجھے اب سکندر کے ساتھ نہیں رہنا۔ یہ انتہا تھی جو اس نے کہا تھا۔ میں اس سے زیادہ تذلیل برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے تو جب سکندر کا فون آیا تو میں نے اس سے بات کرنے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ ڈیڈی نے کہا بھی کہ "سن تو لو وہ کیا کہتا ہے۔" ممی

نے مشورہ دیا۔

"سارے دروازے بند نہیں کرنے چاہئیں۔ ایک راستہ رکھنا چاہئے تا کہ اگر پلٹ چاہیں تو پلٹ سکیں۔"

لیکن مجھے تو نہیں پلٹنا تھا...... میں نے زندگی بڑے اعتماد اور یقین سے گزاری تھی...... مجھے ہمیشہ محبتیں ملی تھیں مجھے کبھی کسی نے ڈی گریڈ نہیں کیا۔ ہمیشہ سراہا گیا تعریف کی گئی۔ میرے ٹیلنٹ کی، میری ذہانت کی اور میرے کانفیڈنس کی، لیکن سکندر نے تو مجھے زیر کر دیا تھا۔ مجھے اپنا کھویا ہوا اعتماد بحال کرنا تھا۔ اسے کھوجتے کھوجتے میں خود کچھ نہیں رہی تھی۔

مجھے اب مزید نہیں جھکنا تھا۔ سو جتنی بار بھی سکندر کا فون آیا میں نے اس سے بات نہیں کی...... کیوں کرتی میں اس سے بات...... کتنی رکیک کتنی گھٹیا بات کی تھی اس نے ۔ میں اور بلال، بلال اور میں۔

تب میں نے فیصلہ کیا کہ میں پھر سے جاب کروں گی اور اسی خیال سے میں نے اپنے کاغذات نکالے تا کہ کہیں جاب کے لئے اپلائی کر سکوں۔ میں اگر سعد خان کے آفس چلی جاتی تو وہ بخوشی مجھے پھر سے جاب دے دیتے لیکن میں وہاں جاب نہیں کرنا چاہتی تھی س
میں نے بیگ سے اپنے کاغذات کی فائل نکالی جو میں آتے ہوئے اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ اندر کی طرف فائل کے گتے پر لکھا تھا۔

میں جانتا ہوں۔
کہ تیرے سب خواب ریشمی ہیں۔
تو میری کھدر رفاقتوں کا بھرم
کہیں بھی نہ رکھ سکے گا۔

پتانہیں کب، کس وقت سکندر نے یہ مصرعے لکھے تھے۔ میں کتنی ہی دیر تک یونہی سکندر کی تحریر دیکھتی رہی۔ اس کی ہینڈ رائیٹنگ بہت خوبصورت تھی۔ کتنے ہی لمحے میرے آنکھوں کے سامنے سے آکر گزر گئے اور میرے اندر جیسے کچھ پگھلنے لگا۔ ہولے ہولے میرے غصہ ختم ہو گیا اور صرف محبت رہ گئی۔

وہ محبت جو میں نے سکندر سے کی تھی۔ جو میں سکندر سے کرتی ہوں تب سے جب سے اس کے نام کی انگوٹھی میں نے اپنی انگلی میں پہنی۔ میں نے اس کے ساتھ گزارا ایک ایک لمحہ یاد کیا جس میں خوشگوار اور خوبصورت لمحے تو گنے چنے تھے پھر بھی........ پھر بھی مجھے لگا میں نے غلطی کی تھی۔

جب بلال علیحدگی اور خلع کی بات کرتا ہے تو میرے اندر جیسے کوئی بھالا اتر جاتا ہے۔

"نہیں...... سکندر نہیں تو کوئی نہیں۔" میں نے کتنی ہی بار اس کے آفس فون کیا۔ کراچی آفس میں بھی اور ابوظہبی آفس میں بھی۔ لیکن پتانہیں کیوں اس سے رابطہ ہی نہیں ہو پاتا۔ اسد ملک بھی چپ سادھے ہے۔

"پتانہیں بھابھی! وہ کہاں ہے۔؟"

ہر بار اس کا یہی جواب ہوتا ہے۔

یہاں سے تو ابوظہبی ہی گیا تھا لیکن پتانہیں سائیٹ پر کہاں ہے۔ لیکن آپ پریشان نہ ہوں آ جائے گا۔ وہ یونہی خود کو کام میں گم کر دیتا ہے۔"

اسے کیا خبر کہ میں کیوں پریشان ہوں۔ میرا من مجھے کیا کچوکے لگاتا رہتا ہے...... کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے جیسے اسے خبر ہو لیکن وہ جان بوجھ کر نہیں بتا رہا۔ شاید سکندر نے اسے منع کیا ہے۔

حالانکہ وہ ایسا تو نہیں تھا۔ پہلے جب بھی زیادتی کرتا تھا تو اسے احساس ہو جاتا تھا اور وہ مختلف حیلوں بہانوں سے اس زیادتی کی تلافی کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن اب کے ہاں میں نے بھی تو بات نہیں کی تھی۔ کتنی ہی بار اس کا فون آیا تو...... شاید اسے غصہ آ گیا ہو...... لیکن وہ پھر بھی تو فون کر سکتا تھا...... مگر پتانہیں کیوں اس نے فون نہیں کیا۔ پھر بھی میرا دل کہتا ہے کہ ایک روز وہ آئے گا۔ ضرور مجھے لینے' وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔

شاید اس نے مجھ سے محبت نہ کی ہو۔

پھر بھی مجھے اس کا انتظار کرنا ہے۔

"یہ سب میری وجہ سے ہوا اوج؟" کبھی کبھی بلال کہتا ہے۔

"لوگ اتنی اتھلی سوچ کیوں رکھتے ہیں اور سکندر بھائی! مجھے یقین نہیں آتا...... وہ تو مجھے بہت اچھے لگے تھے' اتنے شاندار اور میں نے تمہاری خوش قسمتی پر رشک کیا تھا۔ کیا خبر تمہیں ان کی بات سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو۔ اوج! کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے نا۔ مرد تھکا ہارا آفس سے آتا ہے۔ آفس کا کوئی مسئلہ اسے چڑچڑا کر دیتا ہے۔"

لیکن میں بلال کو کیسے سمجھاؤں۔ وہ تو روز اول سے ایسا ہی ہے۔ اپنی ذات کے سمندر میں ڈوبا۔

لیکن میں نے جلد بازی کی اور آتے سے سوچا تک نہ کہ اس کے بغیر زندگی بے معنی ہے۔

وہ تو ہر وقت میری نگاہوں کے سامنے رہتا ہے۔ اس کا اٹھنا' اس کا بیٹھنا' اس کی گفتگو' اس کے طنز' اس کا غصہ اور اس کی وہ کبھی کبھی سراہتی والہانہ نظریں۔

میں نے بلال اور ممی سے کہہ دیا ہے کہ وہ آئندہ مجھ سے خلع والی تکلیف دہ بات نہ کریں۔ ڈیڈی نے از حد حیران ہو کر مجھے دیکھا تھا اور ممی جھنجھلا گئی تھیں۔

’’ اس لڑکی کا دماغ خراب ہے۔ اتنی لمبی عمر تنہا کیسے گزرے گی۔‘‘

ڈیڈی نے ممی کی بات کا جواب نہیں دیا تھا اور سوچ میں ڈوب گئے تھے...... لیکن میں جانتی ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔

انتظار اور صرف انتظار چاہے یہ انتظار صدیوں پر محیط ہو جائے۔

میں فون کی ہر بیل پر یوں فون کی طرف لپکتی ہوں‘ جیسے یہ اس کا فون ہو۔

شاید کسی روز اسے اس محبت کا ادراک ہو جائے جو کسی روز لمحہ بھر کے لئے اس کے دل میں روشنی بن کر اتری تھی اور وہ میرے گھر تک چلا آیا تھا۔

شاید کسی روز وہ ماضی کی زنجیروں سے خود کو آزاد کرا لے اور حال کی خوبصورتیوں کو پہچان لے۔

کبھی کبھی میں سوچتی ہوں‘ شاید سکندر کو محبتوں پر یقین نہیں تھا۔ تب ہی تو وہ میری طرف آتے آتے لوٹ جاتا تھا۔

شاید اس کے اندر کوئی انتقامی جذبہ پل رہا تھا۔ شاید ماضی میں کسی نے اس کے ساتھ بے وفائی کی ہو..... شاید کوئی افزا علوی۔

اور پھر کسی نے اس کا دکھ نہ بانٹا ہو۔ ڈیڈی نے بتایا تھا نا کہ اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے سوائے سوتیلے بہن بھائیوں کے۔ جن کا سلوک اسکے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ شاید تب ہی وہ اپنے دکھ کسی سے نہیں کہہ سکا..... شاید انجانے میں وہ افزا علوی کی زیادتیوں کا بدلہ مجھ سے لیتا ہو۔

مجھے دکھ دے کر بے بس کر کے خوشی محسوس کرتا ہو۔ لیکن جو کچھ بھی تھا اس کے اور میرے درمیان جو مقدس بندھن ہے میں اسے ہمیشہ باقی رکھوں گی۔ چاہے ممی اور بلال کتنی ہی کوشش کیوں نہ کر لیں کیونکہ میں ماضی کی اوج کمال

اور حال کی اوج سکندر‘ سکندر علوی سے شدید محبت کرتی ہوں۔ اتنی شدید کہ میرا ہر سانس جیسے اس کے سانس کے ساتھ بندھا ہے۔ اور آج ایک سال گزرنے کے بعد بھی میری ہر صبح اس امید کے ساتھ طلوع ہوتی ہے۔ کہ وہ آ جائے گا اور ہر شام ایک نئے انتظار کے ساتھ۔

ہاں مجھے اس کا انتظار کرنا ہے۔

بھلے یہ انتظار صدیوں پر محیط ہو جائے۔

♥ ♥ ♥ ♥

اور میرا جی چاہتا ہے کہ میں ساری دنیا کو اپنی مٹھی میں لے لوں اور توڑ پھوڑ کر رکھ دوں۔ بالکل ایسے ہی جیسے مجھے توڑا پھوڑا گیا ہے یا پھر پوری دنیا کو اپنے قدموں تلے روندتا ہوا گزر جاؤں' اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھوں اور پھر کہیں بہت بلندی پر کھڑے ہو کر اس روندی کچلی ہوئی دنیا کو دیکھوں اور اس کی بے بسی پر قہقہے لگاؤں۔ زور زور سے ہنسوں اور خوشی سے فضا میں ہاتھ پھیلائے رقص کروں...... کہ کل دنیا نے مجھے روندا تھا آج یہ میرے قدموں تلے ہے۔

مجھے تو یہ پوری دنیا ہی زہر لگتی ہے۔ یہ چلتے پھرتے' ہنستے مسکراتے فخر سے سر اٹھائے لوگ۔

اعتماد سے بات کرتے ہوئے۔

زندگی میں کامیابیاں حاصل کرتے ہوئے لوگ۔

ہاں' مجھے خود اعتماد لوگ اچھے نہیں لگتے۔

ہنستے ہوئے خوش اور مطمئن اور کامیاب لوگ مجھے اپنے دشمن لگتے ہیں۔ ہاں بے بسی سے روتے ہوئے۔ کچھ کرنے کی خواہش رکھتے ہوئے کچھ نہ کر سکنے والے لوگ مجھے پسند ہیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے تسکین ہوتی ہے۔ عجیب طرح کا سکون میرے اندر اتر آتا ہے۔ بڑی طمانیت محسوس ہوتی ہے۔

شاید میرے اندر کچھ نفسیاتی گرہیں ہیں۔

ایک بار اوج نے بھی کہا تھا۔

"سکندر! تم اپنے آپ کو کھوجتے کیوں نہیں۔ کون سی چیز تمہیں ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔"

میں اوج پر ہنسا تھا۔

"میرا سب کچھ میرے سامنے ہے۔ میں بھلا کیا کھوجوں اور کیوں؟ ہاں تم نے اپنی ذات کے بہت سارے حصوں پر پردے ڈال رکھے ہیں اور اپنا آپ چھپا رکھا ہے۔ خود سے بھی اور مجھ سے بھی۔"

اس کے صبیح چہرے پر یکدم زردی کھنڈ آئی تھی۔ اور بے بسی سے ہونٹ کاٹتی' اوج سکندر کو دیکھ کر مجھے بہت سکون مل رہا تھا بہت طمانیت مل رہی تھی۔ ایسا ہی تو دیکھنا چاہتا تھا میں اسے۔ بے بس اور کمزور۔

اس بھری دنیا میں کوئی شخص بھی مجھے اپنا نہیں لگتا۔ پوری دنیا مجھے اپنی دشمن لگتی ہے اور میں پوری دنیا کو اپنے قدموں تلے روند دینا چاہتا ہوں' حالانکہ مجھے اپنے قدموں تلے روندنے والے اور مجھ پر حقارت سے ہنسنے والے صرف گنے چنے لوگ ہیں۔

نجیب اللہ علوی' مجیب اللہ علوی میرے سوتیلے بھائی۔

اسمارہ علوی میری سوتیلی بہن۔

اور رقیہ علوی میری سوتیلی ماں۔

میرے اصل مجرم تو یہ ہیں۔

مجھے پاؤں تلے کچلنے' مجھے مارنے والے لیکن کبھی کبھی میں۔ ان میں اپنے باپ حمید اللہ علوی اور اپنی ماں افزا علوی کو بھی شامل کر لیتا ہوں۔ حالانکہ میرا باپ جب تک زندہ رہا۔ اس نے مجھ سے بے حد' بے حساب محبت کی' اپنے بڑے بیٹوں اور بیٹی سے بھی زیادہ.......

کیونکہ میں افزا علوی کا بیٹا تھا۔

اس کی من چاہی بیوی۔

جس سے اس نے پہلی ہی نظر میں محبت کی تھی اور پہلی بار ہی اسے دیکھتے ہی اسے اپنی زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ سو وہ مجھ سے بے حد محبت کرتا تھا۔ لیکن پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ مجھے بے بس اور حقیر بنانے میں اس کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ وہ میرا پہلا مجرم ہے۔ سو میں بھی کبھی کبھی اس کے لئے اپنے دل میں بڑی نفرت محسوس کرتا ہوں۔ اتنی نفرت کہ اگر کبھی وہ زندہ ہوتا اور میرے سامنے ہوتا تو شاید میں کسی روز اس کا گلا گھونٹ دیتا۔ لیکن اگر وہ زندہ رہتا تو کوئی مجھے قدموں تلے کیسے روند سکتا تھا لیکن پھر بھی غلطی تو اس نے کی تھی اور اس غلطی کی سزا مجھے ملی۔ آخر اسے کیا ضرورت تھی کہ اس عمر میں جب اس کے بچے جوان ہو رہے تھے اور شادی کی عمر میں پہنچ رہے تھے خود شادی رچا بیٹھا۔ میں اکثر گھنٹوں سوچتا رہتا ہوں کہ آخر کیا ضرورت تھی اسے اس عمر میں شادی کی۔

خدا نے اسے اولاد دی تھی۔ بیٹے بھی اور بیٹی بھی۔

نجیب اللہ علوی تب بیس سال کا تھا۔

اور اسما را علوی سترہ سال کی۔

اور اس کی شادی کو تیس برس گزر چکے تھے۔ پھر تیس برسوں بعد اسے اچانک رقیہ علوی میں کیا کمی نظر آ گئی تھی کہ اس نے اس کی تیس سالہ خدمت گزاریوں کو بھلا دیا۔ حالانکہ

میں نے غور کیا تھا کئی بار اور سوچا تھا۔

رقیہ علوی ایک سگھڑ خاتون تھی۔ اس نے گھر کو صاف ستھرا رکھا ہوا تھا۔

کھانے بہت اچھے بناتی تھی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے ہاتھ میں بہت ذائقہ تھا۔ مجھے اس کے بنائے کھانوں جیسا مزا اور کہیں نہیں ملا۔

وہ تین ذہین' خوبصورت اور صحت مند بچوں کی ماں تھی' اس کا پلڑا تو بہت بھاری تھا۔ لیکن پھر بھی حمید اللہ علوی نے میری ماں افزا علوی سے شادی کر لی۔

میری ماں سے شاید اس لئے کہ وہ بہت خوبصورت تھی۔

کم عمر تھی۔ نازک تھی۔ جب حمید اللہ علوی نے اس سے شادی کی تو اس کی عمر صرف بیس سال تھی۔ اور نجیب اللہ علوی بھی بیس سال کا تھا۔

حیرت ہے کہ حمید اللہ علوی نے اسے اپنے لئے پسند کر لیا' حالانکہ وہ چاہتا تو اسے اپنی بہو بھی بنا سکتا تھا۔ اور اس سے شادی کرتے ہوئے ایک لمحہ کے لئے بھی نہ سوچا کہ جس لڑکی سے وہ شادی کرنے والا ہے' وہ اس کے بیٹے کی ہم عمر ہے اور مجھے اپنے باپ پر ہی نہیں اپنی ماں پر بھی بہت غصہ ہے۔ کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ اگر کبھی وہ میرے سامنے مجسم ہو کر آ جائے تو میں اس سے پوچھوں کہ آخر ایسی کیا آفت پڑی تھی کہ اس نے ایک تین بچوں کے باپ سے شادی کر لی۔

مانا کہ اس کے والدین فوت ہو چکے تھے اور وہ رشتے کے کسی عزیز کے ہاں رہ رہی تھی جو اپنے جوان ہوتے بچوں کی وجہ سے اسے مزید رکھنے سے قاصر تھے اور چاہ رہے تھے کہ جلد از جلد اسے بیاہ دیں۔ شاید وہ بھی اس کی خوبصورتی سے جلتے تھے۔ اور انہیں ڈر تھا کہ کہیں ان کے لڑکوں میں سے کوئی اس قاتل حسن کے سامنے ہتھیار نہ ڈال دے جبکہ وہ اپنے بیٹوں کی ذہانت خوبصورتی اور تعلیم کو کیش کروانا چاہتے تھے' اور کسی امیر گھرانے سے رشتہ جوڑ کر اپنے بیٹوں کے لئے وہ سب کچھ حاصل کرنا چاہتے تھے' جو وہ افزا علی سے اپنے کسی بیٹے کو بیاہ کر نہیں

کر سکتے تھے۔

لیکن پھر بھی انہیں افزا سے محبت تھی ہمدردی تھی۔ آخر وہ ان کے گھر پلی بڑھی تھی۔

اس لئے انہوں نے حمید اللہ علوی کا پروپوزل قبول کرنے سے پہلے کئی شرائط منوائی تھیں۔ مثلاً الگ پورشن' ماہانہ خرچ اور ایک فلیٹ اس کے نام۔ بزنس میں اس کا اور اس کی اولاد کا حصہ۔

اور حمید اللہ علوی نے ان کی ہر شرط مان لی تھی۔ اور رخصتی سے پہلے ہی اپنے وسیع و عریض گھر کے فرسٹ فلور میں کچھ تبدیلیاں کر کے اسے نہ صرف نئے سرے سے ڈیکوریٹ کیا تھا بلکہ اس کی سیڑھیاں جو پہلے ٹی وی لاؤنج میں تھیں انہیں باہر کی سمت بھی کروا دیا تھا یوں بالکل الگ پورشن بن گیا تھا اور افزا علوی جب رخصت ہو کر علوی بلڈنگ میں آئی تو اسے کسی جھگڑے یا تلخی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

پھر بھی مجھے اپنے ماں پر بہت غصہ آتا تھا۔ آخر حمید اللہ علوی سے شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یا وہ کچھ انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ ممکن تھا اسے حمید اللہ علوی سے بہتر کوئی شخص مل جاتا جس کے تین بچے نہ ہوتے۔

اور نہ ہی ایک بیوی ہوتی۔

حالانکہ وہ پڑھی لکھی تھی' خوبصورت تھی اور اسے یقیناً کوئی بہتر شخص مل جاتا۔ لیکن اس نے بھی سوچا تھا کہ حمید اللہ علوی جس نے اپنی آدھی جائیداد اس کے نام لکھ دی تھی اپنی نوعمر بیوی کی بہت قدر کرے گا اور وہ ساری عمر بادشاہت کرتی رہے گی.........

لیکن حمید اللہ علوی ایک دن اسے روتا بلکتا چھوڑ کر چلا گیا۔

آخر کو وہ غاصب تھی۔

رقیہ بیگم کی بادشاہت کی غاصب۔

تو اس سے جتنا بھی برا سلوک کیا جاتا کم تھا۔ ہاں تو مجھے اپنی ماں پر غصہ تھا کہ اس

نے حمید اللہ علوی کے بجائے کسی اور سے شادی کیوں نہ کی۔ بھلے وہ شخص امیر نہ ہوتا لیکن مجھے رقیہ علوی سے یہ تو نہ سننا پڑتا۔

ڈائن' غاصب' ڈکیت۔

وہ اکثر ان ہی ناموں سے افزا علوی کو یاد کرتی تھی۔ اس لئے مجھے اپنی ماں پر غصہ آتا تھا۔ کیا ضرورت تھی اسے غاصب بننے کی' میں نے اکثر اپنی سوتیلی ماں یعنی رقیہ علوی سے سنا تھا کہ ایک شادی میں حمید اللہ علوی اسے دیکھ کر دل ہار بیٹھے تھے۔ اور ایک نظر دیکھتے ہی انہوں نے اس سے شادی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں یہ تو نہیں جانتا کہ انہوں نے پہلے سے ہی دوسری شادی کا ارادہ کر رکھا تھا یا اچانک ہی افزا علی کو دیکھ کر فیصلہ کیا تھا لیکن بقول رقیہ علوی کے اس روز شادی کی اس تقریب میں افزا علی کو دیکھ کر حمید اللہ سے صبر نہ ہو سکا تھا اور وہ اگلی صبح ہی افزا کے رشتہ داروں کے گھر جا پہنچے تھے اور انہوں نے حمید اللہ کے پروپوزل کو نعمت سمجھ کر فوراً قبول کر لیا تھا۔ اور جب رقیہ علوی اپنی اونچی ناک کو بھول کر افزا علی کی منت کرنے گئی تھی کہ وہ اس پر ظلم نہ کرے اور اس شادی سے انکار کر دے تو پہلے تو مسلسل روتی رہی تھی اور پھر جب رقیہ علوی نے اپنی انانیت کو مار کر اپنے ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیے تھے تو اس نے وعدہ کر لیا تھا' لیکن پھر اس وعدے کو نبھایا نہ تھا اور بڑی شان' سے حمید اللہ کی گاڑی میں بیٹھ کر علوی ہاؤس آ گئی تھی۔ بقول رقیہ علوی کے اس کے سینے پر مونگ دلنے کے لئے۔ لیکن رقیہ علوی کے برعکس۔

ایک بار مالی بابا نے مجھے بتایا تھا کہ ایسا نہیں تھا۔ حمید اللہ علوی اس کو پہلی ہی نظر دیکھ کر اس پر فدا نہیں ہوا تھا' بلکہ اس شادی میں افزا علی کے گارجین جو حمید اللہ کے اچھے خاصے دوست بھی تھے انہوں نے حمید اللہ علوی سے خود درخواست کی تھی کہ افزا کے رشتے کے سلسلے میں وہ اس کی مدد کریں اور حمید اللہ نے اپنے آپ کو پیش کر دیا تھا حالانکہ وہ اپنے بیٹے کے لئے بھی افزا علی کا رشتہ مانگ سکتا تھا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔

بہر حال وجہ جو بھی ہو مجھے ان دونوں سے شکوہ ہے۔ گلہ ہے اور ان پر بہت سارا غصہ ہے۔

حالانکہ حمید اللہ علوی نے افزا علی کو جواب حمید اللہ سے شادی کرنے کے بعد افزا علوی بن گئی تھی۔ سچ مچ پھولوں کی سیج پر بٹھا دیا تھا۔ شریعت اور مذہب کے راستے پر چلتے ہوئے وہ تین دن رقیہ کے ہاں رہتا اور تین دن اس کے ہاں اور کوشش کرتا کہ کسی کے حقوق کی بھی پامالی نہ ہو۔ اگر وہ افزا علوی کے لئے کوئی چیز لاتا تو رقیہ کے لئے بھی ضرور لاتا۔ اس نے افزا کو کنگن بنوا کر دیے تو رقیہ کے لئے بھی لے گیا۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ ساری جیولری جو وقتاً فوقتاً حمید اللہ علوی نے افزا علوی کو لا کر دی تھی اس کی وفات کے بعد نجیب اللہ علوی اور مجیب اللہ علوی نے ماں کے ساتھ مل کر چھین لی تھی۔

حمید اللہ تین بچوں کا باپ تھا۔ عمر میں افزا علی سے بہت زیادہ تھا پھر بھی افزا علوی اس کی سنگت میں اتنی خوش تھی کہ شاید وہ کسی ہم عمر کے ساتھ بھی نہ ہوتی۔ خوشی اور مسرت نے اسے پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت بنا دیا تھا ایسے میں میری یعنی سکندر علوی کی آمد نے افزا علوی کو معتبر اور مکمل کر دیا تھا۔

اور اب پتا نہیں حمید اللہ علوی توازن برقرار رکھتے رکھتے تھک گیا تھا کہ رقیہ بیگم کی زبان پر کانٹے اگ آئے تھے یا سکندر علوی کی شرارتیں اور حرکتیں ہی اتنی پیاری تھیں کہ حمید اللہ علوی ہولے ہولے صرف آفزا علوی کا ہی ہو کر رہ گیا تھا۔

مہینوں بعد اسے نیچے جانے کا خیال آتا اور اب جانے واقعی افزا علوی نے اسے نیچے جانے سے منع کیا یا یہ صرف الزام تھا رقیہ علوی کا کہ افزا نے اسے منع کر دیا ہے۔ لیکن وہ باہر ہر ایک سے یہی کہتی پھرتی تھی اور حمید اللہ علوی اس کی اس بات کی بالکل پروا نہ کرتا تھا۔

اور سکندر کے یوں لاڈ اٹھاتا جیسے وہ اس کا پہلوٹھی کا بچہ ہو۔ اس کے لئے اس نے کھلونوں کے ڈھیر لگا دیے تھے۔

پانچ سال کی عمر تک وہ اسے گود میں اٹھائے اٹھائے **پھرتا تھا**۔ افزا حمید اللہ علوی کو اس کے یوں لاڈ اٹھاتے دیکھ کر ہنستی۔

”کیا آپ نے پہلے بچوں کے بھی یونہی لاڈ اٹھائے ہیں۔“

”نہیں، نجیب جب پیدا ہوا تو مجھے وہ پیارا تو بہت لگتا تھا' لیکن **اس کو پیار کرتے شرم** آتی تھی کہ اماں ابا کیا سوچیں گے اور پھر جب مجیب ہوا تو نجیب چونکہ دادا دادی **کا لاڈلا تھا** اس لئے مجیب ماں اور نانی کا لاڈلا بن گیا۔ میں جب گھر آتا تو اس وقت عام طور پر اپنے ماموں یا نانی کی طرف گیا ہوتا۔ ہاں میں نے اسمارا کے لاڈ اٹھائے ہیں۔ لیکن یہ........ یہ سکندر علوی تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ سب سے پیارا اس لئے کہ یہ محبت کی نشانی ہے۔ افزا میں نے تم سے محبت کی ہے۔“

یوں میں یعنی سکندر علوی نے سات سال کی عمر تک بہت لاڈ اٹھوائے۔ تین سال کی عمر میں مجھے حمید اللہ علوی نے شہر کے سب سے بہترین اسکول کی نرسری میں داخل کروا دیا تھا اور دو سال اس کوکڈ کیمپس میں پڑھنے کے بعد امریکن گرامر امریکن میں مجھے داخل کروا دیا گیا۔ جہاں میں نے تقریباً دو سال پڑھا اور اس وقت جب حمید اللہ علوی کا انتقال ہوا تو میری عمر سات سال تھی اور میں کلاس ٹو کا طالب علم تھا........ بہت ذہین اور لائق۔

میں نے ون میں پوزیشن لی تھی اور جس روز سالانہ فنکشن میں حمید اللہ علوی اور افزا علوی نے مجھے اسٹیج پر جا کر اپنا انعام لیتے دیکھا تھا تو مجھے یاد ہے خوشی سے بہت دیر تک وہ تالیاں بجاتے رہے تھے اور جب میں اپنی شیلڈ لے کر ان کے پاس آیا تھا تو حمید اللہ علوی نے مجھے اتنی دیر تک بانہوں میں لے کر چوما تھا کہ میں گھبرا گیا تھا...... اور انہوں نے واپس گھر آتے ہوئے بار بار کہا تھا۔

”سکندر اگلے سال بھی تمہاری شیلڈ پر فرسٹ ہی لکھا ہوا چاہئے۔ اور اگر تم ٹو میں بھی فرسٹ آئے تو میں تمہیں بہترین گفٹ لے دوں گا۔“ لیکن پھر وہ میرے امتحان سے پہلے ہی چلے گئے۔

♥ ♥ ♥ ♥

اس روز رقیہ علوی کو نہ جانے کس بات پر غصہ آیا ہوا تھا۔ وہ بہت چیخ چیخ کر بول رہی تھیں۔ اتنا چیخ کر کہ ان کی آواز اوپر تک آ رہی تھی۔

''یہ نیچے والی آنٹی اتنا کیوں چیخ رہی ہیں؟''

میں نے اپنی مما سے پوچھا تھا۔ میں انہیں آنٹی ہی کہتا تھا اور اس وقت مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ رقیہ علوی سے میرا کیا رشتہ ہے اور یہ کہ رقیہ علوی حمید اللہ علوی کی بیوی ہے۔

اور افزا علوی نے سہم کر حمید اللہ علوی کی طرف دیکھا تھا۔

''آپ کتنے دنوں سے نیچے نہیں گئے۔''

''بہت دنوں سے۔'' وہ اطمینان سے صوفے پر بیٹھے رہے۔

''آپ کو جانا چاہئے تھا۔'' افزا علوی نے کہا۔

میں قریب بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ اور یہ باتیں میرے ذہن میں اس لئے بھی رہ گئی

ہیں کہ اس روز اس صوفے پر میں نے آخری بار حمید اللہ علوی کو بیٹھے اور باتیں کرتے دیکھا تھا...... آپ کو حیرت تو ہوگی کہ میں اپنے باپ کو حمید اللہ علوی کہہ کر کیوں بلاتا ہوں....... پپا یا ڈیڈی یا ابو کیوں نہیں کہتا...... جب وہ زندہ تھے تو انہیں پپا کہتا تھا لیکن پھر ان کے بعد کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد میں انہیں حمید اللہ علوی ہی کہنے لگا۔

شاید اس لئے کہ رقیہ علوی ہمیشہ ان کا ذکر کرتے ہوئے حمید اللہ ہی کہتی تھی۔

یا پھر اس لئے کہ جب میں نے انہیں یعنی اپنے باپ کو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کیا تو وہ میرے لئے پپا نہ رہے صرف حمید اللہ علوی رہ گئے۔ ہاں تو حمید اللہ علوی اس روز صوفے پر بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے انہوں نے اخبار ایک طرف رکھ دیا.....

''کیا کروں، جتنی دیر نیچے رہتا ہوں۔ ٹینس رہتا ہوں۔ بچے بات نہیں کرتے اور رقیہ مسلسل خنجر چبھوتی رہتی ہے۔''

''پھر بھی آپ کا فرض ہے کہ ان کی خبر گیری کریں اور حال احوال پوچھیں۔ کل میں چچا کی طرف جانے کے لئے سیڑھیوں سے اتری تو اسمارہ کو میں نے گیٹ سے نکلتے دیکھا۔ وہ رو رہی تھی....... مجھے دیکھ کر منہ موڑ لیا۔ میں نے بلایا بھی...... پوچھا بھی کہ کیا بات ہے۔ لیکن اس نے جواب نہ دیا اور گیٹ بند کر کے واپس اندر چلی گئی۔''

''ماں سے ضد کی ہوگی کچھ لینے کی اور ضد پوری نہ ہونے پر رو رہی ہوگی۔ وہ ایسی ہی ہے۔''

حمید اللہ علوی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اتر آئی اور وہ کھڑے ہوگئے

''میں دیکھتا ہوں''۔

ضرور کوئی فرمائش ہوگی، کوئی بہت قیمتی سوٹ یا جیولری۔''

''لے دیجئے گا۔'' افزا علوی بھی مسکرائی۔

''بچیاں ماں باپ سے ہی لاڈ کرتی ہیں۔ پھر پتا نہیں اگلے گھر میں کوئی فرمائشیں

پوری بھی کرتا ہے یا نہیں۔''

اور اپنا والٹ جیب میں ڈال کر حمید اللہ علوی نیچے اتر گئے اور اس وقت اگر مجھے خبر ہوتی۔ اب حمید اللہ علوی کبھی واپس نہیں آئے گا اور میری زندگی جہنم بن جائے گی تو میں اس کے قدموں سے لپٹ جاتا۔ زنجیر بن جاتا اور روک لیتا....... لیکن میری طرح افزا علوی بھی بے خبر تھی لہذا وہ اس طرح مسکراتی ہوئی میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''سونو.......! تمہیں ایک بہن چاہئے۔ چھوٹی سی پیاری سی۔ گڑیا ایسی۔ تو اللہ میاں سے دعا کرو کہ اللہ تمہیں ایک پیاری سی گڑیا سی بہن دے دے۔''

''نہیں، بھلا میں بہن لے کر کیا کروں گا۔ مجھے تو بھائی چاہئے...... جس سے کرکٹ کھیل سکوں۔''

''لیکن مجھے تو بیٹی چاہئے نا۔ جب تم اور تمہارے پپا گھر پر نہیں ہوں گے تو ہم دونوں مل کر تمہارے لئے کھانے تیار کریں گے، اور تمہارا انتظار کریں گے تمہاری بہن تمہیں کپڑے استری کر کے دے گی تمہارا کمرہ صاف کرے گی۔ بہنیں تو بہت اچھی ہوتی ہیں۔''

''اچھا!''

میں افزا علوی کی بات پر ایمان لے آیا تھا۔

''میں اللہ میاں سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے ایک بھائی اور ایک بہن دونوں دے دے۔''

میں نے دونوں ہاتھ دعا کے لئے اٹھا دیئے اور افزا علوی کھلکھلا کر ہنس دی۔ اور یہ آخری ہنسی جو میں نے افزا علوی کے ہونٹوں پر دیکھی تھی۔ پھر میں نے کبھی افزا علوی کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ ہنستے ہنستے میرے پاس سے اٹھی تھی اور میں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے کہ نیچے سے زور زور سے رونے پیٹنے کی آوازیں آنے لگیں۔ افزا علوی کی آنکھوں میں خوف سمٹ آیا اور ہونٹ بند ہو گئے۔

''مما!'' میں نے ہاتھ نیچے گرا دیئے۔ ''یہ....... کیسا شور ہے۔'' لیکن افزا علوی میری بات کا جواب دیئے بغیر آنکھوں میں وحشت بھرے نیچے دوڑتی چلی گئی تھی۔ اور میں بھی اس کے پیچھے بھاگا تھا میرے ذہن میں یہ بات آئی تھی کہ یہ ضرور نیچے والی آنٹی کے ہاں کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔ وہاں سب لوگ ٹی وی لاؤنج میں جمع تھے۔

اسماء علوی اور رقیہ علوی چیخیں مار رہی تھیں، جبکہ نجیب اللہ علوی اور مجیب اللہ علوی خاموش کھڑے تھے۔ اور ٹی وی لاؤنج کے بیچوں بیچ حمید اللہ علوی گرے پڑے تھے۔ افزا علوی بھاگتی ہوئی ان کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی تھی۔ اور کبھی کلائی ہاتھوں میں لے کر نبض دیکھتی کبھی بند آنکھوں کو تب ہی گیٹ پر ایمبولینس کا ہارن بجنے لگا۔

''اب ایمبولینس کا کیا فائدہ، ڈیڈی ختم ہو چکے۔'' مجھے ابھی تک نجیب اللہ علوی کی سرد مہری یاد ہے۔

''لیکن پھر بھی ڈاکٹر کو بلاؤ۔ تصدیق تو کر دے۔'' کسی نے کہا شاید رقیہ علوی نے۔ میں سہما سہما سا کھڑا حمید اللہ علوی کو دیکھ رہا تھا جس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرہ خطرناک حد تک زرد...... پھر ڈاکٹر نے آ کر تصدیق کر دی۔ مجھے یاد ہے وہیں لاؤنج میں ہی ایک چارپائی پر حمید اللہ علوی کو لٹا دیا گیا تھا۔ اور میں حیران تھا کہ پپا کو یہاں کیوں لٹا دیا گیا ہے اگر وہ بیمار ہیں تو پھر بھی انہیں اپنے گھر میں ہونا چاہئے۔

''مما!'' میں نے یہی بات پوچھنے کے لئے جب افزا علوی کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ مجھے بازوؤں میں کھینچ کر زور زور سے رونے لگی۔

''سونو! تیرے پپا چلے گئے، وہ مر گئے۔''

اور پھر اس نے چارپائی کی پٹی پر زور زور سے سر مارا اپنی چوڑیاں توڑ دیں۔

میں کبھی رونے لگتا اور کبھی چپ ہو جاتا اور افزا علوی کا دامن کھینچنے لگتا کہ اوپر اپنے گھر چلو لیکن وہ تو بس روئے چلی جاتی۔ اور پھر پتا نہیں کب میں روتے روتے افزا علوی کی

گود میں ہی سو گیا تھا۔ اور جب دوبارہ میری آنکھیں کھلی تھیں تو نجیب اللہ علوی افزا علوی کو دھکے دے رہا تھا۔

''نکل جاؤ یہاں سے۔''

''نہیں نہیں۔'' وہ چیخ رہی تھی۔ ''مجھے مت نکالو یہاں سے مجھے آخری بار ان کا چہرہ دیکھ لینے دو۔''

نجیب اللہ علوی کی آنکھوں سے آگ نکل رہی تھی۔ پھر کچھ لوگ اسے پکڑ کر لے گئے۔ اردگرد ہجوم تھا۔ لوگوں کی بھنبھناہٹ تھی۔

افزا کو بیاہ کر لایا تھا۔ حمید اللہ علوی پوری شان سے۔ حق سچ کی بیوی ہے وہ کوئی بھگا کر تو نہیں لایا تھا' کوئی کیسے اٹھا سکتا ہے اسے اس کی میت سے۔''

ایسی ہی سرگوشیاں میرے کانوں میں پڑتی رہیں اور ان کے معنی بہت بعد میں جان پایا میں۔ افزا علوی ہر وقت روتی رہتی۔

''مما! آپ نہ رویا کریں۔'' مجھے اس کے رونے سے گھبراہٹ ہوتی۔

''میں ہوں نا..... پھر آپ کو کیوں ڈر لگتا ہے۔ یا پھر اللہ میاں سے کہیں وہ ہمیں بھی اپنے پاس بلا لے۔ ہم بھی وہاں ہی رہیں گے پپا کے پاس۔''

اور وہ مجھے لپٹا کر اور زیادہ رونے لگتی۔ پھر ہولے ہولے اس کا رونا کم ہو گیا۔ وہ کچھ سوچنے لگی۔ پھر ایک دن اسکول سے لیٹر آ گیا۔ کہ اگر میں نے مزید چھٹیاں کیں تو میرا نام کاٹ دیا جائے گا۔ تب افزا علوی میری انگلی پکڑ کر پھر ایک بار نیچے گئی۔ نجیب علوی سامنے ہی صوفے پر بیٹھا تھا۔

''کیوں آئی ہو؟'' اس کے لہجے میں اتنی حقارت اور آنکھوں میں اتنی نفرت تھی کہ میں نے سہم کر اور مضبوطی سے افزا کی انگلی تھام لی۔

''سونو کے اسکول سے لیٹر آیا ہے۔ اگر اسکول نہ گیا تو نام کٹ جائے گا' تم صبح

جاتے ہوئے اسے سکول چھوڑ جایا کرو۔ اسی کالج جاتی ہے تم جاتے ہو نا اسے چھوڑنے۔ یہ بھی تمہارا بھائی ہے تمہارے باپ کا خون اس کی رگوں میں ہے''۔

''اونہہ!'' نجیب اللہ علوی غصے سے پھنکارا۔

''نہیں ہے یہ میرا بھائی۔''

اور تب ہی رقیہ علوی کسی کمرے سے باہر نکلی۔

''افزا بیگم! میرے گھر میں قدم رکھنے کی تمہیں جرات کیسے ہوئی نکل جاؤ یہاں سے اور آئندہ قدم مت رکھنا نہیں تو دھکے دے کر نکلوا دوں گی' غاصب ڈائن' میرے سہاگ کو کھا گئی۔ میرے بچوں سے ان کا باپ چھیننے والی۔''

اس نے افزا علوی کو ہلکا سا دھکا دیا اور افزا علوی روتے ہوئے باہر نکل آئی۔ وہ عدت میں تھی لیکن اب ہر روز مجھے اسکول چھوڑنے اور لینے جاتی۔ ان دنوں میں افزا علی سے شدید محبت کرتا تھا اگر وہ چند منٹ کے لئے بھی ادھر ادھر ہوتی تو میں گھبرا جاتا۔

خوف زدہ ہو جاتا' اسے آوازیں دینے لگتا۔ وہ کچن میں ہوتی تو میں کچن کے نزدیک بیٹھا ہوم ورک کرتا اور گاہے گاہے اسے دیکھتا رہتا۔

وہ واش روم میں جاتی تو واش روم کے باہر کھڑا رہتا۔ اسے باتھ لینے میں دیر ہو جاتی تو میں گھبرا کر دروازہ کھٹکھٹانے لگتا' میرے دل میں خوف سا بیٹھ گیا تھا کہ کہیں حمید اللہ علوی کی طرح کسی دن اچانک وہ بھی اللہ میاں کے پاس نہ چلی جائے۔ میں اکثر رات کو جب بیڈ پر سونے کے لئے لیٹتا تو انہیں یاد کر کے چپکے چپکے روتا جب وہ زندہ تھے تو میں ان ہی کے پاس سوتا تھا۔ ان دنوں تو مما اور پپا ہی میری زندگی تھے۔ مجرم تو وہ بہت بعد میں بنے تھے میرے۔ میں افزا علوی اور حمید اللہ علوی سے بہت شدید محبت کرتا تھا۔ میں نے ان کے علاوہ کسی اور رشتے کو نہیں دیکھا تھا۔ میری ساری محبتوں کا محور یہی دونوں تھے۔

حمید اللہ علوی اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے اور افزا علوی کے والدین کا بھی

انتقال ہو چکا تھا اور رشتے کے وہی عزیز جنہوں نے اس کی پرورش کی تھی وہ بھی اس شہر سے کہیں اور جا چکے تھے۔ افزا علوی اکثر انہیں یاد کرتی تھی۔

''انکل صلاح الدین اور آنٹی مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں۔ بہت پیار سے رکھا انہوں نے میں چودہ سال کی تھی۔ جب ایک حادثے میں والد کی وفات کے بعد میں بے یارو مددگار رہ گئی تھی۔ وہ گھر جس میں ہم رہتے تھے گورنمنٹ کی طرف سے ملا ہوا تھا اور اس بھرے شہر میں انکل صلاح الدین کے علاوہ میرا کوئی عزیز نہ تھا...... بلکہ انکل صلاح الدین سے بھی بہت دور کی قرابت تھی اصل وجہ تو یہ تھی کہ انکل میرے ابا کے بہت گہرے دوست تھے۔ میری والدہ میرے بچپن میں ہی فوت ہو گئی تھی۔ میں نے کسی قریبی عزیز کا ذکر ابا سے کبھی نہیں سنا تھا۔ اگر کوئی ہوں بھی تو ابا نے نہ کبھی ذکر کیا نہ وہ کبھی آئے' اس لئے جب مجھے گھر خالی کرنے کے لئے کہا گیا تو انکل صلاح الدین مجھے اپنے گھر لے گئے۔ ان کی بیٹی نہیں تھی بس تین بیٹے تھے۔ کمال' جمال اور نہال...... کمال اعلیٰ تعلیم کے لئے ملک سے باہر گئے ہوئے تھے اور نہال اور جمال مجھے بے حد چاہنے لگے تھے بالکل بہنوں کی طرح۔''

''مگر اب وہ کہاں ہیں؟'' میں پوچھتا۔ ''وہ ہمارے گھر کیوں نہیں آتے؟''

''پتا نہیں۔'' افزا علوی کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

''میری شادی کے بعد وہ لوگ یہاں سے کسی اور شہر میں شفٹ ہو گئے تھے۔''

''کیا وہ بتا کر نہیں گئے تھے کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔''

''نہیں...... شاید ان دنوں ہم لوگ یہاں نہ تھے' میں اور تمہارے پپا کاغان گئے ہوئے تھے۔''

''اور اگر وہ آ جائیں تو؟...''

میں ان دنوں اکثر سوچتا اور دعا کرتا رہتا تھا کہ اللہ کرے ایک روز جمال اور نہال ماموں آ جائیں تو پھر ہم مل کر نجیب اللہ کو خوب ماریں گے۔''

میں ہوا میں مکے چلاتا۔

میں ماموں کو بتاؤں گا کہ نجیب اللہ علوی نے مما سے بدتمیزی کی تھی اور کیا پتا انہوں نے مل کر پپا کو مار دیا ہو۔ ان دنوں مجھے شک ہی نہیں یقین تھا کہ پپا کو انہوں نے مارا ہے۔ مجھے کہانیاں اور وہ بھی جاسوسی پڑھنے کا بہت شوق تھا۔

ان دنوں اس کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ اس لئے اس نے میرے لئے ویگن لگوا دی تھی۔ میں اب تھری کلاس میں آ گیا تھا۔ اور میں نے ٹو کلاس میں بھی پہلی پوزیشن لی تھی۔ ہمارا سالانہ فنکش ہونے والا تھا لیکن پپا نہیں تھے۔ اور اس روز کسی نے بہت دیر تک میرے لئے تالیاں نہیں بجائی تھیں۔ اور نہ ہی کسی نے مجھے بہت دیر تک چوما تھا۔ میں ایک کونے میں کھڑا ہو کر رونے لگا۔ تب سرجان میرے پاس آ گئے۔

''ہیلو بوائے ''Whats matter''

''نتھنگ سر!'' میں نے آنسو پونچھ لیے۔

ہمارے اس امریکن گرامر اسکول میں زیادہ تر اسٹاف غیر ملکی تھا..... سرجان بھی ہالینڈ سے آئے تھے۔ اور اسکول کے ہاسٹل کے قریب بنی اسٹاف کی کالونی میں رہتے تھے۔

انہوں نے ہولے سے میرے گالوں کو چھوا۔

"Be brave" بہادر بنو ہم سب کو ایک دن مرجانا ہے۔''

انہوں نے پھر میرے گال تھپتھپائے۔ ''اور خدا سے دعا کرو کہ تمہارا ڈیڈ جنت میں جائے۔''

جب میں گھر آیا تو افزا علوی کی گود میں منہ چھپا کر بہت دیر تک رویا اور افزا علوی بھی مجھے بانہوں میں لپیٹ کر دیر تک روتی رہی میں نے اپنی شیلڈ اور سرٹیفکیٹ پپا کی تصویر کے ساتھ وہاں رکھ دیے جہاں پہلی شیلڈ پڑی تھی۔ اس روز میرا بہت جی چاہا کہ اللہ میاں تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی میرے پپا کو بھیج دیں..... یا پھر جمال ماموں اور نہال ماموں اور کمال

ماموں آ جائیں۔

اس وقت میں نے اس پر کبھی غور نہیں کیا تھا کہ مما کو تو ان کا ایڈریس معلوم نہیں تھا انہیں تو افزا علوی کا ایڈریس پتا تھا اور وہ جو اتنی محبت سے جمال ماموں اور نہال ماموں کا ذکر کرتی تھی تو وہ تو آ سکتے تھے نا۔ خود اس سے ملنے اور جب مجھے اس کا خیال آیا تھا تو میں دس سال کا تھا اور میں نے یہی بات افزا علوی سے پوچھ لی تھی.....

''مما! جمال ماموں اور نہال ماموں کو تو ہمارا گھر پتا ہے نا تو اتنے سالوں میں وہ خود کیوں نہ آ گئے۔''

اور افزا علی یکدم خاموش ہو گئی تھی اور پھر اس نے سر جھکا کر کہا تھا۔

''پتا نہیں۔'' اور اٹھ کر کچن میں چلی گئی تھیں۔

♥ ♥ ♥ ♥

اس روز جب فنکشن تھا، میں روتے روتے سو گیا تھا۔ اور جب میری آنکھ کھلی تھی تو افزا علوی کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ اس نے کمرے لاک کیے تھے اور مجھے تیار ہونے کو کہا تھا۔

''مما! ہم کہیں جا رہے ہیں؟'' کیا جمال ماموں کے گھر؟''

میں نے شاید تصوّر ہی تصوّر میں جمال کو اپنا آئیڈیل بنا لیا تھا...... افزا علوی سے اس کا ذکر سن سن کر۔ وہ وکیل تھا' وہ بہادر تھا' وہ غلط بات برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا..... وہ غنڈوں سے بھی بھڑ جاتا تھا شاید اس لئے.......

''نہیں۔ ہم ہاسپٹل جا رہے ہیں۔''

''کیا آپ کی طبیعت خراب ہے؟''

''نہیں وہاں سے ہم تمہارا بھائی یا بہن لے کر آئیں گے۔''

اور میں خوش ہو گیا۔ افزا علوی سے اور کوئی سوال نہیں کیا تھا..... اور دوڑ دوڑ کر وہ

ساری چیزیں جو افزا علوی نے کہی تھی' اکٹھی کر کے باسکٹ میں رکھنے لگا۔ پھر افزا علوی کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ کر ہم ہاسپٹل آ گئے۔

وہاں ایک نرس سے افزا علوی نے کچھ بات کی۔

شاید افزا علوی نے اس دن کے لئے پہلے ہی اس سے بات کی ہوئی تھی۔

''آؤ بیٹا!'' نرس نے مجھے پیار کیا۔

افزا علوی نے بھی مجھے کہا کہ میں اس نرس کے ساتھ چلا جاؤں۔ میں مچل اٹھا کہ میں اس کے ساتھ رہوں گا۔ مجھے خوف تھا کہ اگر وہ اکیلی ہوتو کہیں حمید اللہ علوی کی طرح ہی اللہ میاں کے پاس ہی نہ چلی جائے لیکن افزا علوی نے مجھے سمجھایا کہ ہاسپٹل میں بچوں کو رہنے کی اجازت نہیں ہے...... اور پھر وہ نرس مجھے اپنے کوارٹر میں چھوڑ گئی جو ہاسپٹل کے اندر ہی تھا۔ وہاں ایک اور نرس بھی تھی' اس نے مجھے رات کا کھانا کھلایا تھا اور سونے کی تاکید کی تھی لیکن مجھے نیند نہیں آ رہی تھی اور میرا دل خوف سے کانپ رہا تھا۔ پھر اس نرس نے مجھے کہانی سنائی تھی بہت دلچسپ اور میں کہانی سنتے سنتے سو گیا تھا۔

نرس نے صبح ہی صبح آ کر خوشخبری سنائی ''تمہارا بھائی آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے پھولوں کی ٹوکری میں رکھ کر نیچے بھیج دیا ہے' تمہاری مما کے پاس۔''

''لیکن اللہ میاں اس بھائی کو ہمارے گھر بھی تو بھیج سکتے تھے۔ مجھے یہاں نیند نہیں آ رہی تھی۔''

میں شاید اندر سے بہت ناراض بچہ تھا۔ تب میری خفگی پر نرس زور سے ہنس دی تھی۔

یہ نرس بھی عجیب تھی۔ زور سے ہنستی تھی اور فٹافٹ رو بھی پڑتی تھی میں جب اس کے ساتھ ہاسپٹل جا رہا تھا۔ افزا علوی اور بھائی کو دیکھنے۔ تو میں نے اس سے پوچھا تھا۔

''سسٹر! کیا اللہ میاں نے جس طرح سے میرے بھائی کو بھیجا ہے۔ کیا میرے پپا کو نہیں بھیج سکتے۔ میں اگر دعا کروں تو۔''

''بھائی تو چھوٹا سا ہے نا اور......'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''پپا تو بڑے ہیں نا وہ چھوٹی سی باسکٹ میں کیسے آ سکتے ہیں۔''

''لیکن سسٹر! اللہ میاں تو سب کچھ کر سکتا ہے نا۔ اس نے یہ اتنی بڑی دنیا بنائی ہے۔ ہم سب کو بنایا ہے تو وہ بڑی ساری ٹوکری بھی بنا سکتا ہے نا.....؟

مجھے حجت کرنے کی عادت تھی لیکن سسٹر رونے لگی اس نے مجھ لپٹایا اور پیار کیا۔

میں ہاسپٹل پہنچنے تک مسلسل سوال کرتا رہا۔ اور سسٹر مسکرا مسکرا کر میرے سوالوں کے جواب دیتی رہی وہ بہت پیارا اور خوبصورت تھا اور میرا دل اسے دیکھ کر خوشی سے بھر گیا تھا اور میں نے دل ہی دل میں بہت دعائیں کی تھیں کہ وہ جلدی سے بڑا ہو جائے افزا علوی کی آنکھوں میں نمی تھی اور وہ اداس اداس سی لگ رہی تھی۔

''جب سونو پیدا ہوا تھا' آپ کو یاد ہے سسٹر! اس کے پپا...... وہ نرس سے کہہ رہی تھی اور میں کاٹ میں پڑے بچے کو مسلسل تک رہا تھا۔

''ہاں یاد ہے۔'' سسٹر پھر رونے لگی۔ عجیب عورت تھی پل میں روتی پل میں ہنستی۔ میں نے مڑ کر افزا علوی کو دیکھا۔ وہ شاید اس لئے اداس تھی کہ اس نے مجھے بہن کے لئے دعا کرنے کو کہا تھا اور میں نے بھائی کے لئے دعا کی تھی اور اللہ میاں نے میری دعا سن لی تھی۔

''مما! آپ اداس نہ ہوں۔'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے تسلی دی۔ ''میں اللہ میاں سے دعا کروں گا کہ وہ ایک بہن بھی دے دے' آپ کو بھائی اچھا نہیں لگا۔''

'نو..... نو سونو ڈیر! یہ تو بہت کیوٹ ہے۔''

افزا علوی کے بجائے نرس نے جواب دیا۔

افزا علوی آنسو پونچھتی رہیں...... اور نرس کبھی روتی' کبھی ہنستی رہی' میں کاٹ کے پاس کھڑا سوئے ہوئے بھائی کو دیکھتا رہا۔

''مما! ہم اس کا کیا نام رکھیں گے۔''

نرس کے جانے کے بعد میں نے پوچھا۔

''یہ تمہارا بھائی ہے' اللہ میاں نے تمہاری دعا پر اسے بھیجا تھا' اس لئے تم ہی اس کا نام رکھ دو۔''

''میں .....'' میری آنکھیں چمکنے لگیں۔ افزا علوی نے مجھے یکدم معتبر کر دیا تھا۔

میں نے سوچا میں بھائی کا نام ماجد خان رکھوں گا۔ مجھے ماجد خان بہت اچھا لگتا تھا اس کا کھیل بھی۔

جب ہم ٹیکسی میں بیٹھ رہے تھے تو سسٹر نے افزا علوی سے کہا تھا کہ وہ مجھ سے ملنے گھر آیا کرے گی اور افزا علوی مسکرا دی تھی۔

''ضرور سسٹر! آپ ضرور آیئے گا۔ یوں بھی ہم بہت اکیلے ہیں۔ آپ کا خلوص' آپ کی محبت ہمیں ہمیشہ یاد رہے گی۔''

ہم بہت خوش خوش گھر آئے تھے۔ میں سارا راستہ بھائی کو دیکھتا رہا۔ وہ افزا علوی کی گود میں گہری نیند سو رہا تھا..... اور سوتے میں منہ بناتا۔ کبھی مسکراتا' کبھی بسورنے لگتا۔

لیکن شاید خوشیاں اب ہمیں راس نہیں آتی تھیں۔ خوشی حمید اللہ علوی کے ساتھ ہی ہمارے گھر سے رخصت ہو گئی تھی۔ جب ہم اپنے گھر کے سامنے پہنچے تو دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔

افزا علوی نے گھبرا کر مجھے دیکھا اور پھر بھائی کو سنبھالتی تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی اور میں باسکٹ اٹھائے اس کے پیچھے پیچھے چڑھنے لگا۔

ٹی..... وی لاؤنج کا سامان بکھرا پڑا تھا۔ ٹرالی کی درازیں کھلی تھیں۔ افزا علی کچھ دیر ٹی..... وی لاؤنج کے درمیان کھڑی رہی۔ پھر اس نے بھائی کو صوفے پر لٹایا اور دیوانوں کی طرح سب کمرے دیکھ ڈالے۔

چور سب کچھ لے گئے تھے۔ لاکر سے تمام زیورات' نقد رقم' بانڈز' ٹی وی' فریج' اوون..... سب کچھ..... افزا علوی تھک کر رونے لگی اونچا اونچا۔

میری سائیکل جو حمید اللہ علوی میری برتھ ڈے پر گفٹ کرنے لائے تھے۔ وہ بھی اٹھا کر لے گئے تھے۔ کچھ بھی تو نہیں بچا تھا..... افزا علوی کی حالت خراب ہو گئی۔ وہ شاید بے ہوش ہو گئی تھی۔

''مما..... مما!''

میں بہت دیر تک اسے بلاتا رہا اور چلاتا رہا پھر روتا ہوا نیچے بھاگا۔ نجیب اللہ علوی لان میں کھڑا مالی سے باتیں کر رہا تھا۔

''پلیز انکل! میرے ساتھ چلیں' اور میری مما بے ہوش ہو گئی ہیں یا شاید پپا کے پاس چلی گئی ہیں۔'' یہ لفظ میں نے بمشکل ادا کیے تھے۔ تب مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ نجیب اللہ علوی سے میرا کیا رشتہ ہے۔

''تو میں کیا کروں؟''

وہ مالی کے ہاتھ سے پائپ لے کر گھاس پر پانی ڈالنے لگا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے بے بسی سے..... میں ہونٹ کاٹتا ہوا واپس پلٹا تو مالی نے مجھے آواز دی۔

''ٹھہرو بیٹا! تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔'' نجیب اللہ علوی نے غصے سے اسے گھورا۔

لیکن مالی کچھ بڑبڑاتا ہوا میرے پیچھے چل پڑا۔

سیڑھیوں میں ہی مجھے منے بھائی کے رونے کی آواز آئی..... میں بھاگتا ہوا اوپر پہنچا۔ افزا علوی آنکھیں کھولے بے حس سی منے بھائی کے رونے کی آواز سن رہی تھی۔

''مما! بھائی رو رہا ہے۔''

افزا علوی کو آنکھیں کھولے دیکھ کر جیسے میرے اندر مسرت کی ایک لہر سی دوڑ گئی تھی۔

افزا علوی نے اٹھ کر بھائی کو گود میں لے لیا۔ اور روتے ہوئے مالی سے پوچھا۔

''مالی بابا..... یہ..... سب کیسے ہوا۔ چور سب لوٹ کر لے گئے۔ حالانکہ گیٹ پر چوبیس گھنٹے چوکیدار ہوتا ہے۔''

"وہ بی بی! میں کیا بتاؤں؟" مالی نے نظریں چرالی تھیں۔ل افزا علوی کچھ دیر اسے دیکھتی رہی۔

"تم جانتے ہو' بابا! تمہیں پتا ہے کون چور ہے۔ کس نے چوری کیا سب کچھ .....؟"

تب ہی نجیب اللہ علوی بھی سیڑھیاں چڑھ کر ٹی۔وی۔لاؤنج میں آ گیا۔

"کیوں چیخ رہی ہو؟" اس کے لہجے میں تحقیر تھی۔

"کیوں نہ چیخوں....... تم.... یہ سب تم نے کیا ہے۔" یہ میرے گھر میں چوری تم نے کروائی ہے۔

"تمہارا گھر۔" وہ تحقیر سے ہنسا' "یہ ہمارا گھر ہے۔ اور ہم جب چاہیں' تمہیں اس گھر سے دھکے دے کر باہر نکال دیں۔"

"نہیں..... یہ گھر میرا ہے۔ میں یہاں بیاہ کر آئی تھی۔ حمید اللہ علوی مجھے بھگا کر نہیں لایا تھا۔ بے شمار لوگوں کی موجودگی میں آئی تھی یہاں......"

"اچھا!" وہ پھر ہنسا۔

"یہ چوری تم نے کروائی ہے۔ میرے زیورات اور میری چیزیں کہاں ہیں۔ مجھے واپس کردو سب۔"

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ یہ چوری میں نے کروائی ہے۔"

"ثبوت' مجھے یقین ہے۔" افزا علوی یکدم رونے لگی زور زور سے۔ "مت کرو ایسا میرے ساتھ ہم پر رحم کھاؤ۔ یہ دونوں تمہارے بھائی ہیں۔ حمید اللہ علوی کے بیٹے ہیں۔ اس کی جائیداد میں برابر کے حصہ دار۔"

"ہماری جائیداد کے حصہ دار۔" اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔ "اس غلط فہمی میں مت رہنا اور دو دن کے اندر اندر اپنی اولاد کو لے کر نکل جاؤ یہاں سے۔"

"کہاں..... کہاں جاؤں گی میں؟" افزا علوی کی آنکھوں میں وحشت بھر گئی۔

"ہاں' یہ سوچنے والی بات ہے کہاں جاؤ گی تم۔" وہ ابھی تک سیڑھیوں کے پاس ریلینگ کے پاس کھڑا تھا۔

"اپنے فلیٹ میں ...... جو اپنی اداؤں سے تم نے اپنے نام کروالیا تھا..... لیکن نہیں ......" وہ استہزائیہ سی ہنسی ہنسا۔

اس کے کاغذات تو چور اٹھالے گئے ہوں گے ویری سیڈ..... چچ چچ۔"

اس نے ہاتھ اٹھا کر تمسخر سے افزا علوی کو دیکھا۔

"اب کیسے ثابت کروگی کچھ ......"

یکدم اس کے چہرے کے نقوش کرخت ہوگئے اور لہجے میں سختی آ گئی۔

"تم نے سنا افزا علوی! دو دن بعد میں تمہیں یہاں نہ دیکھوں۔"

"نہیں نہیں' جاؤں گی میں کبھی نہیں' مر کر بھی تم مجھے یہاں سے نکال نہ سکو گے۔"

افزا علوی ایک ہاتھ میں بچے کو سنبھالتے ہوئے نجیب اللہ علوی کی طرف بڑھی ا ایک ہاتھ سے اسے دھکیلنے لگی۔

"جاؤ نکل جاؤ یہاں سے۔ میں حمید اللہ علوی کی بیوی ہوں۔ شرعاً اور قانوناً جا بیوی۔"

"اچھا!" نجیب اللہ علوی نے تمسخر سے یوں ہی اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس ہاتھ پکڑ لیا۔ "تم مجھے یہاں سے نکل جانے کو کہہ رہی ہو تم۔"

اس نے اس کے ہاتھ کو ہلکا سا جھٹکا دیا ..... پھر پتا نہیں کیسے منا بھائی افزا علو کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا.... پتا نہیں اس نے ہی بے دھیانی میں اپنا ہاتھ چھڑانے کے ہاتھ اوپر اٹھایا تھا یا اس کی گرفت کمزور تھی کہ جھٹکے سے وہ ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ میں تو صرف یہ دیکھا تھا کہ منا بھائی لڑھکتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے جارہا تھا...... افزا علوی وحش سے آنکھیں کھولے کھڑی تھی جیسے سکتہ ہو گیا ہو۔ میں زور سے چیخا تھا اور سیڑھیوں کی طرف

تھا اور میری چیخ نے افزا علوی کا سکتہ توڑ دیا تھا۔ وہ بھی ایک ہاتھ سے نجیب اللہ کو دھکا دیتی وحشت سے چیختی ہوئی سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگی تھی۔ میں وہ اور میرے پیچھے مالی بابا ہم سب تقریباً ایک ساتھ ہی نیچے پہنچے تھے۔ منا بھائی پپا کے پاس جا چکا تھا۔ اس کی ناک اور منہ سے خون نکل رہا تھا۔ افزا علوی نے اسے ایک دم اٹھا کر سینے سے بھینچ لیا۔ لیکن یکدم اسے زور سے ہچکی آئی تھی اور اس کے منہ سے خون نکلا تھا ڈھیر سارا۔

مالی بابا سر جھکائے کھڑے تھے۔ نجیب اللہ علوی پاس سے ایک نظر افزا علوی اور اس کی گود میں پڑے بچے پر ڈالتا ہوا گزر گیا۔ مجھے ادراک ہو گیا تھا۔ خود بخود ہی کہ کہیں کچھ غلط ہو گیا ہے۔ منا بھائی چلا گیا ہے۔ دور..... اس سمے میں نے نجیب اللہ علوی کے لئے اتنی نفرت محسوس کی اتنی نفرت کہ اس نفرت سے آج تک میرا اندر زہریلا ہو رہا ہے۔ حمید اللہ علوی کے صرف چھ ماہ بعد یہ دوسرا بڑا نقصان ہوا تھا میرا..... میرے ننھے سے وجود میں آگ سی دہک اٹھی تھی۔ آج بھی جب میں اس منظر کو ذہن میں لاتا ہوں آخری سیڑھی کے پاس گود میں منے بھائی کو لئے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کے زخمی وجود کو تکتے ہوئے سکتے کی سی حالت میں بیٹھی ہوئی افزا علوی' تو میرا خون کھولنے لگتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے' میں ساری دنیا کو توڑ پھوڑ کر رکھ دوں۔ میں ہوا میں باؤلنگ اور بیٹنگ کرتا ہوں...... اور میرے سامنے ماجد خان آ جاتا ہے۔ میرا منا بھائی جیسے ماجد خان بنتا تھا' لیکن جو....... افزا علوی مجھے سمجھایا کرتی تھی ''وہ اتنی ہی زندگی لے کر آیا تھا۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ اس کے پپا وہاں اکیلے ہیں۔ یہاں تو تم ہو نا میرے پاس۔''

لیکن مجھے اس کی بات سے اتفاق نہ تھا۔

میں کرکٹ کے میچ نہیں دیکھتا کیونکہ ان میچوں میں میرا ماجد خان نہیں ہوتا۔ جسے میری دعا پر اللہ میاں نے میرے لئے بھیجا تھا۔

♥ ♥ ♥ ♥

نجیب اللہ علوی نے جو کہا تھا' وہ سچ کر دکھایا تھا۔ اور ہمیں اس گھر سے نکال دیا تھا۔

کچھ دن ہم اسی نرس کے کوارٹر میں رہے تھے جو پل میں روتی اور پل میں ہنستی تھی۔ پھر افزا علوی نے ایک پرائیوٹ اسکول میں جاب کر لی اور ایک چھوٹا سا گھر لے کر رہنے لگی...... وہ صبح مجھے اسکول چھوڑتی اور پھر اپنے اسکول میں چلی جاتی چھٹی کے وقت وہ مجھے وہاں سے لے لیتی۔ لیکن نہ تو مجھے یہ گھر پسند تھا اور نہ ہی اس مسافر ویگن میں بیٹھ کر اسکول جانا پسند تھا...... اسکول ویگن سے مما نے میرا نام کٹوا دیا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ مما کے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔ مجھے یہ بھی پتا تھا کہ چوروں نے سب کچھ چوری کر لیا ہے۔ اور ان چوروں کو نجیب اللہ علوی نے بھیجا تھا۔ لیکن اس کے باوجود میں بہت چپ چپ اور اداس رہنے لگا تھا۔

پھر ایک دن مما نے مجھ سے کہا کہ اب وہ مجھے کسی اور اسکول میں داخل کروا دیں گی۔

''نہیں' میں کسی اسکول میں نہیں جاؤں گا۔ میں یہاں ہی پڑھوں گا۔''

میں نے ضد کی مچل کر رونے لگا'' حالانکہ میں اس حقیقت کا ادراک رکھتا تھا کہ یہ افزا علوی کی مجبوری ہے۔ میں جانتا تھا کہ کل شام افزا علوی نے مجھے تھوڑے سے آلو تل کر روٹی کے ساتھ دیے تھے۔ اور خود قہوے کے ساتھ روٹی کھائی تھی.... پھر بھلا اس اتنے مہنگے اسکول کی فیس وہ کہاں سے دے سکتی تھی۔ پھر بھی میں مچل مچل کر رو رہا تھا۔ یہ رونا دراصل اسکول تبدیل کرنے پر نہیں تھا...... یہ بہت ساری دوسری باتوں کا رونا تھا بہت سارے آنسو جو بہت دنوں سے میرے اندر جمع ہو گئے تھے آج اس بہانے بہہ نکلے۔

اس روز میں اتنا رویا کہ مجھے بخار ہو گیا اور افزا علوی پریشان ہو گئی۔

مجھے دو دن تک شدید بخار رہا اور میں بہانے بہانے روتا رہا..... میرے اندر جو بہت سارا رونا اکٹھا ہو گیا تھا..... وہ سب آنسو میں نے بہا دیے۔ میں جو بہت صابر بچہ تھا۔ افزا علوی آنکھوں میں آنسو بھرے مجھے دیکھتی۔

''سنو! تم نے تو کبھی ضد نہیں کی تھی میری جان! مما کی مجبوری کو سمجھو۔''

میں اس کی مجبوری سمجھتا تھا' لیکن میں ان آنسوؤں کا کیا کرتا جو اندر ہی اندر جمع ہو کر دریا بن گئے تھے' انہیں کسی نہ کسی صورت تو بہنا ہی تھا..... سو میں دو دن وقفے وقفے سے روتا رہا..... پھر دو دن بعد میرا بخار اترا اگلے دو روز تک کمزوری بھی جاتی رہی۔

اور افزا علوی نے مجھ سے کہا کہ میں تیار ہو جاؤں وہ مجھے اسکول چھوڑ دے گی۔

''نہیں مجھے اسکول نہیں جانا۔ میں گھر میں ہی آپ سے پڑھ لوں گا۔''

''لیکن تم تو اسکول نہ چھوڑنے کے لئے اتنا روئے تھے۔ میں نے سوچا ہے میں کچھ ٹیوشن بھی کرلوں گی۔

تمہاری سسٹر آنٹی نے مجھے کچھ ٹیوشن دلوانے کا وعدہ کیا ہے۔''

''نہیں' آپ ٹیوشن نہ کریں۔ بس اسکول سے آ کر میرے پاس رہا کریں۔ اور

مجھے پڑھایا کریں۔ بلکہ آپ مجھے اپنے ساتھ ہی اسکول لے جایا کریں اپنے والے اسکول میں وہاں تو فیس تھوڑی ہو گی نا۔''

افزا علوی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''لیکن تم تیار تو ہو جاؤ نا' تمہارا سٹرفکیٹ لینا ہے۔''

اور پھر ہم امریکن گرامر اسکول میں آ گئے سر جان ہمیں اسکول میں جاتے ہی مل گئے تھے۔

''ہیلو بوائے کہاں چلے گئے تھے۔؟''

''سر! میں بیمار تھا۔''

میں نے جواب دیا اور افزا علوی کا تعارف کروایا۔

''یہ میری مما ہیں۔''

''آپ کا بیٹا بہت خوبصورت اور ذہین ہے۔ یہ بہت آگے جائے گا۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ اس اسکول کا نام روشن کرے گا۔''

افزا علوی نے سر جھکا لیا تھا۔

ساری بات سن کر سر جان کچھ دیر خاموش کھڑے رہے افسردہ سے۔

''اس کی فیس ہاف ہو سکتی ہے۔''

''لیکن اس اسکول کی ہاف فیس بھی میرے لئے بہت زیادہ ہے۔''

''او کے'' انہوں نے جیسے فیصلہ کیا۔'' باقی کی ہاف فیس میں اپنی جیب سے ادا کر دوں گا۔''

افزا علوی نے اور میں نے بھی بہت انکار کیا۔ لیکن انہوں نے بہت اصرار کیا۔

''یہ ادھار ہے' جب یہ بڑا ہو کر کسی مقام پر پہنچے گا تو ادھار اتار دے گا۔''

اور میں نے دل ہی دل میں سوچ لیا تھا کہ اگر افزا علوی نے سر جان کی بات مان لی

تو میں بڑا ہو کر سرجان کا سارا ادھار چکا دوں گا اور افزا علوی نے سرجان کی آفر قبول کر لی تھی...... اس روز گھر واپس آتے ہوئے میں نے کہا۔

''مما! آپ کمال انکل، جمال انکل کے پاس کیوں نہیں جاتیں۔ کیا وہ ہمیں نہیں رکھیں گے۔''

''وہ...... وہ تو بہت خوش ہوں گے۔ نہال تو خوشی سے ناچنے لگے گا..... اور لیکن......''

''لیکن..... کیا؟''

''ہمیں یہ جو نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں۔''

''وہ جو ان کا پرانا گھر تھا۔ وہاں جا کر محلے سے پتا کریں، شاید کسی کو پتا ہو۔'' میں نے مما سے کہا۔

مجھے اپنی تو فکر نہ تھی، مجھے افزا علوی کی فکر تھی کہ وہ روز بروز پیلی ہوتی جا رہی تھی۔ چپکے چپکے روتی تھی۔ مجھے دودھ کا کپ دیتی اور خود چھپ کر بغیر دودھ کے چائے پیتی تھی۔

''اچھا چلیں گے کسی روز.....''

اس وقت افزا علوی نے مجھے ٹال دیا تھا۔ مگر پھر ایک دن جب وہ اسکول سے آ کر بہت روئی تھی۔ جانے کیا بات ہوئی تھی، شاید اس کے اسکول کے سر نے اسے ڈانٹا تھا یا پتا نہیں کیا لیکن اس روز اس نے سسٹر آنٹی سے کہا تھا کہ وہ اس کے لئے کسی اور جگہ نوکری کا بندوبست کر دیں۔

سسٹر نے تھوڑا ہنس کر اور تھوڑا رو کر اسے تسلی دی تھی کہ وہ پہلے ہی کوشش کر رہی ہے کسی اچھی اور بہتر جاب کے لئے تب اس روز سسٹر کے جانے کے بعد افزا علوی نے مجھ سے کہا۔

''سنو بیٹا! آؤ تمہارے جمال ماموں اور نانو نانی کا پتا کریں۔''

اور پھر افزا علوی کے ساتھ پہلی بار میں نے وہ گھر دیکھا جہاں اس نے اپنی زندگی کے بہت سارے سال گزارے تھے..... یہ ایک چھوٹا سا خوبصورت گھر تھا.....

''نہال کی عادت تھی کہ اکثر یہاں سے گیٹ پر سے کود کر آ جاتا تھا ..... وہ کبھی بیل نہیں بجاتا تھا۔''

افزا علوی کی آنکھوں میں اور لہجے میں بڑی بہنوں والی محبت کے رنگ تھے۔ یہ گھر جن لوگوں نے خریدا تھا انہیں علم نہ تھا کہ گھر کے مالک کہاں گئے تھے۔ آس پاس کے کئی گھروں میں ہم لوگ گئے۔ یہ وہ لوگ تھے جو افزا علوی کو جانتے تھے۔ اور ان کے جمال ماموں وغیرہ سے اچھے تعلقات تھے۔ انہوں نے افزا سے افسوس کیا۔ ہمدردی بھی کی لیکن کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ لوگ یہاں سے کس شہر میں گئے تھے۔ اکثر نے حیرت کا بھی اظہار کیا کہ جن لوگوں نے بیٹی کی طرح رکھا شادی کی پھر شادی کے بعد خبر تک کیوں نہ لی۔ کچھ نے انہیں ظالم قرار دیا جنہوں نے اپنے سے دگنی عمر والے اور تین بچوں کے باپ سے شادی کی تھی۔

اس روز میں پہلی بار مایوس ہوا۔ ورنہ میں سوچتا تھا کہ جمال اور نہال ماموں کبھی نہ کبھی ضرور آئیں گے اور پھر ہم مل کر نجیب اللہ سے بدلہ لیں گے۔ پپا کا اور بھائی کا...... اس روز رات کو جب میں بستر پر لیٹا تو میری سوچ کا رنگ تھوڑا بدل گیا تھا۔ میں دل ہی دل میں نجیب اللہ علوی سے اکیلے ہی نمٹنے کے منصوبے بناتا رہا اور خواب میں میں نے اسے سیڑھیوں سے لڑھکتے اور پھر آخری سیڑھی کے پاس بالکل مانی کی طرح۔ میں دل ہی دل میں اسے مانی کہہ کر بلاتا تھا۔ ہاں تو میں نے خواب میں مانی کی طرح خون کی قے کرتے دیکھا تھا اور آنکھیں بند کیے بے بس پڑے ہوئے اس کے منہ سے اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔

نرس آنٹی تھیں جو کبھی کبھی آتی تھیں۔ انہوں نے کئی بار افزا علوی کو مشورہ دیا تھا کہ

اللہ علوی نے شادی سے پہلے ہی اس کے نام کر دیا تھا۔

لیکن افزا علوی کہتی......

''میں تنہا عورت اس معصوم بچے کے ساتھ کیا کروں۔ میں نے اپنا معاملہ خدا پر چھوڑ دیا ہے۔''

لیکن میں نے سوچ رکھا تھا کہ ذرا بڑا ہو جاؤں تو نرس آنٹی سے پوچھ کر نجیب اللہ علوی پر کیس کر دوں گا۔ اپنے منے بھائی کے قتل کا..... اور نجیب اللہ علوی کو پھانسی پر لٹکا دوں گا۔

♥ ♥ ♥ ♥

لیکن تقدیر میرے خوابوں پر ہنس رہی تھی میں جب گیارہ سال کا ہوا تو افزا علوی ایک رات جو سوئی تو پھر صبح نہ اٹھ سکی۔ اس روز اس کی طبیعت صبح سے ہی خراب تھی، اس نے پڑوس سے فون کر کے نرس آنٹی کو بلا لیا تھا اور بہت دیر تک چپکے چپکے اس سے باتیں کرتی رہی تھی۔ نرس آنٹی نے اسے ڈاکٹر سے دوا بھی لا کر دی تھی جسے اس نے یوں ہی ٹیبل پر رکھ دیا تھا اور اس رات ہمیشہ کی طرح سونے سے پہلے جب اس نے میری پیشانی چومی تھی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے جسے اس نے انگلی کی پوروں سے صاف کر لیا تھا.... اور مجھے اپنے پاس بٹھا کر بہت دیر تک مجھ سے باتیں کرتی رہی تھی۔ پپا کی اور جمال انکل کی نہال انکل کی۔ اور اس نے مجھے کہا تھا۔

''بیٹا! اگر کبھی اکیلے رہ جاؤ تو بہادر بننا۔ اور پڑھائی کبھی مت چھوڑنا۔ میری بڑی شدید خواہش ہے کہ تم ایک روز بہت زیادہ پڑھ لکھ کر بہت بڑے آدمی بنو۔''

''مما! کیا آپ کہیں جا رہی ہیں مجھے چھوڑ کر۔''

میں سہم گیا تھا حالانکہ تب میں گیارہ سال کا ہو چکا تھا۔

''بچے کو کیوں پریشان کرتی ہو افزا۔''

نرس آنٹی نے جو اس رات ہمارے گھر ہی رک گئی تھیں۔ افزا علوی کو ڈانٹ دیا۔

''میں نے ڈاکٹر عابد سے بات کر لی ہے۔ کل ہم دونوں صبح چلیں گے ..... صبح میرا آف ہے۔ وہ بہت بڑے ہارٹ اسپیشلسٹ ہیں۔''

''کیا مما کو ہارٹ کی تکلیف ہے سسٹر؟'' میں پریشان ہو گیا تھا۔

''پتا نہیں۔ صبح ڈاکٹر صاحب کو دکھائیں گے' تم اپنی مما کے لئے دعا کرنا سونو.....''

''نرس آنٹی نے کہا اور مما نے مجھے بلایا۔

''سونو! آج ادھر میرے پاس ہی لیٹ جاؤ بیٹا۔'' اور میں مما کا ہاتھ پکڑ کر سو گیا اور پھر جانے کب سوتے میں مما کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ صبح جب میری آنکھ کھلی تو ہمارے گھر کے چھوٹے سے صحن میں کچھ عورتیں کھڑی تھیں اور اونچی اونچی باتیں کر رہی تھیں۔

مما نے سر سے پیر تک چادر اوڑھی ہوئی تھی۔ مجھے اٹھتے دیکھ کر نرس آنٹی دوڑتی ہوئی اندر آئی اور اس نے مجھے گلے لگا لیا اگرچہ میری عمر گیارہ سال تھی۔ لیکن میرا قد نرس آنٹی سے ذرا سا چھوٹا تھا۔

''سونو.....! سونو تمہاری مما چلی گئیں۔''

''کہاں؟'' میں نے نرس آنٹی کی طرف دیکھا۔

''تمہارے پپا کے پاس۔''

اور اونچا اونچا رونے لگی لیکن میں ساکت کھڑا تھا۔ میری آنکھیں خشک تھیں بالکل خشک۔ میں بہت دیر تک یونہی ساکت کھڑا رہا پھر نرس آنٹی نے اپنے آنسو پونچھے اور مجھے

باہوں میں لے لیا لیکن میں آہستگی سے اس کی باہوں سے نکل آیا۔

میں ہولے ہولے چلتا ہوا افزا علوی کے بیڈ تک گیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرہ ناک کے قریب سے نیلا ہو رہا تھا۔ میں لمحہ بھر یونہی اس کے بند ہونٹوں' بند آنکھوں کو دیکھتا رہا۔

''مما! یہ آپ نے مجھ سے اچھا نہیں کیا۔ بالکل اچھا نہیں کیا؟''

میرے اندر سے آواز اٹھی تھی' لیکن میرے ہونٹ بند تھے۔ میں اس سے ناراض اور خفا سا ہو رہا تھا..... یہ انصاف تو نہیں کیا تھا مما نے میرے ساتھ مجھے اس بھری دنیا میں تنہا چھوڑ کر خود پپا کے پاس چلی گئی تھیں۔ میرے اندر غصہ بڑھتا گیا اور رنج بھی سوا ہو گیا۔ میرے آنسوؤں اور سسکیوں نے میرے اندر جیسے طوفان بپا کر دیا تھا لیکن میری آنکھیں خشک تھیں۔

نرس آنٹی نے آگے بڑھ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''سونو بیٹے! یاد ہے رات مما نے آپ سے کیا کہا تھا کہ آپ ایک بہادر بچے ہو۔''

''میں بہادر بچہ نہیں ہوں۔'' افزا علوی کو جانے کیوں یہ غلط فہمی تھی کہ میں بہادر ہوں..... ''میں بہادر نہیں ہوں مما۔''

میں نے دل ہی دل میں شکوہ کیا لیکن میری زبان خاموش تھی اور ہونٹ سختی سے ایک دوسرے سے بھنچے ہوئے تھے۔ میں نے ایک بار پھر غور سے مما کے چہرے کو دیکھا۔ ہونٹوں سے نیچے بھی جگہ ہلکی سی نیلی تھی۔

''نجیب اللہ علوی۔''

میری کنپٹیاں گرم ہو گئیں اور خون رگوں میں کھول اٹھا۔ ''کیا مما کو کسی نے مارا پیٹا ہے۔'' میرا لہجہ سپاٹ تھا اور میری سوالیہ نظریں نرس آنٹی کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

''نہ ..... نہ میری جان! بھلا کس نے مارنا پیٹنا تھا' آپ کی مما کو بہت سوئیر Severe ہارٹ اٹیک ہوا ہے اور جب آدمی کی ڈیتھ ہارٹ اٹیک سے ہوا تو اس طرح

کہیں کہیں جسم نیلا ہو جاتا ہے۔''

میں بغیر جواب دیے پھر مڑ کر افزا علوی کے چہرے کو دیکھنے لگا۔

''مما آپ کتنی ظالم ہیں'' میرے لب ذرا سے کھلے تھے۔ اور میرے اندر سے کوئی گرم سیال جیسے ایک تیز لہر کی صورت آنکھوں کی سمت بڑھا اور میں بھاگتا ہوا وہاں سے باہر چلا گیا اور اسٹور میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ باہر نرس آنٹی کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''سونو..... سونو بیٹا! کہاں چلے گئے ہو۔''

پھر دوسری خواتین کی بھن بھن کوئی آواز۔

''بچے کو اس وقت نہ چھیڑو..... بہت ڈسٹرب ہوا ہے۔ اپنے حال پر چھوڑ دو۔''

''باہر تو نہیں چلا گیا۔'' آنٹی نرس کی آواز۔

''نہیں' ادھر اسٹور میں گیا ہے۔''

کسی نے جواب دیا اور پھر خاموشی چھا گئی۔

میں اسٹور کے فرش پر بیٹھ گیا۔ اور گرم پانی کا سیلاب میری آنکھوں سے بہہ نکلا۔ پتا نہیں کتنی دیر گزر گئی.... باہر عورتوں کے چلنے' باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لیکن میں یونہی بیٹھا رہا۔ میرے جی چاہ رہا تھا میں افزا علوی سے جا کر لڑوں..... اس نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا نا..... مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔

رات نرس آنٹی نے مجھے زبردستی کچھ کھلانے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے کچھ نہیں کھایا تھا.... میں ساری دنیا سے خفا ہو گیا تھا۔

''تمہاری مما کو سال بھر پہلے ہارٹ کی تکلیف ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر عابد نے انہیں ریسٹ کرنے کی اور ٹینس نہ ہونے کی تلقین کی تھی۔ لیکن تین ہزار تنخواہ میں وہ مکان کا کرایہ اور گھر کا خرچ ہی بمشکل پورا کرتی تھیں۔ اپنی میڈیسن کہاں سے لیتیں......'' نرس نے مجھے بتایا تھا۔

''اگر انہیں میرا خیال ہوتا وہ مجھ سے کہتیں۔ ہم بھوکے رہ لیتے اور ان کی دوائیں آ سکتی تھیں۔ لیکن انہیں میرا خیال نہیں تھا اسی لیے چھوڑ کر چلی گئیں۔''

میں نے سوچا اور گرم گرم آنسوؤں سے میرا حلق بھر گیا۔

تین دن بعد نرس آنٹی نے مجھ سے پوچھا تھا۔

''سونو...... میری جان کیا تم نے سوچا ہے کہ تم اب کہاں رہو گے۔''

یہ تو افزا علوی کو سوچنا چاہئے تھا کہ میں اب کہاں رہوں گا۔ اگر وہ سوچتی یہ تو کبھی بھی مجھے یوں چھوڑ کر نہ جاتی ......

میرے اندر پھر ایک گرم سیال کا سیلاب اٹھا جس نے مجھے اندر باہر سے جل تھل کر دیا نرس آنٹی نے مجھے اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔ میری پیشانی پر میرے سر پر' میرے ہاتھوں پر بہت پیار کیا۔ اور مجھے بتایا۔

''سونو! آپ کی مما نے کہا تھا کہ میں آپ کو آپ کے پپا کے گھر' آپ کے بھائیوں کے پاس چھوڑ آؤں۔''

اب جبکہ میں گیارہ سال کا تھا تو یہ جان چکا تھا کہ نجیب اللہ اور مجیب اللہ علوی میرے سوتیلے بھائی ہیں۔

مجھے مما کی اس بات پر از حد حیرت ہوئی۔ نجیب اللہ علوی نے مما کا ہاتھ جھٹکا تھا اور مانی ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا تھا۔ مجھے اس کی آنکھوں کی نفرت اور لہجے کی حقارت یاد آئی تو میرا وجود کانپ گیا۔ انہوں نے ہمیں اس گھر سے نکال دیا تھا۔ وہ بھلا مجھے وہاں کیسے رکھیں گے۔

''اور اگر میں وہاں نہ رہنا چاہوں اور آپ کے ساتھ رہوں تو ......؟ میں نے پوچھا۔

نرس آنٹی کو شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی طلاق ہو گئی تھی اور ان کی اولاد نہ تھی' بس

ایک بوڑھی ماں تھی جو گاؤں میں بیٹے کے پاس رہتی تھی۔ بیٹے کو ان کا نرس بننا پسند نہ تھا اور نرس آنٹی کو بھائی کی بیوی کی گالیاں سننا اور دن بھر گھر کے کام کرنا سو انہوں نے کچھ عرصہ بری بھلی سننے کے بعد نرسنگ کا کورس کر لیا تھا اور یہاں ہاسپٹل میں ملازمت اختیار کر لی تھی اور کبھی کبھار ہی گاؤں جاتی تھیں ماں سے ملنے۔ نرس آنٹی اچھی تھیں۔

''تو میری جان سنو! تب بھی تمہیں وہاں ہی رہنا ہے یہ تمہاری مما کا حکم ہے۔...... میں نے کہا تھا افزا سے کہ میں تمہیں اپنی جان سمجھوں گی...... اور افزا کی طرح ہی تمہارا خیال رکھوں گی' لیکن اس نے کہا اپنے پپا کی جائیداد میں تم بھی برابر کے حصہ دار ہو اور تمہیں وہاں رہ کر اپنا حق لینا ہے۔''

اگر افزا مجھے علوی ہاؤس میں رہنے کا حکم نہ دیتی تو میں مزے سے نرس آنٹی کے پاس رہتا اور اس کی محبتوں کی چھاؤں میں پلتا اور ایک نارمل آدمی کی طرح ہوتا۔ میری ذات میں اتنی گرہیں نہ ہوتیں۔ مجھے دنیا اتنی قابل نفرت نہ لگتی...... میرا دل یوں دنیا کو اپنے پاؤں تلے کچل دینے کو نہ چاہتا۔ میرا وجود اتنا زہریلا نہ ہوتا اور میں...... میں اوج کے ساتھ وہ سب کچھ نہ کرتا جو میں نے کیا ہے۔ لیکن افزا علوی نے حکم دیا تھا سو نرس آنٹی نے مجھے تیار ہونے کو کہا۔

''مجھے کل ڈیوٹی پر جانا ہے۔ اس لئے میں آج ہی تمہیں لے کر علوی ہاؤس جاؤں گی۔ اور پھر...... میں نے تمہاری کتابیں اور دوسری ضروری اشیا رکھ لی ہیں باقی چیزوں کے متعلق بعد میں سوچیں گے کہ کیا کرنا ہے۔ پہلے ہم قبرستان جائیں گے۔''

اس نے بتایا۔ میں نے کچھ جواب نہ دیا تھا۔ اور جب تک وہ تیار ہوتی رہی۔ میں افزا علوی کی چیزیں دیکھتا رہا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر برش تھا جس میں افزا علوی کے بال الجھے ہوئے تھے۔

شاید اس کی طبیعت خراب تھی' اس لئے اس نے برش کر کے برش یوں ہی ڈریسنگ ٹیبل پر چھوڑ دیا تھا۔ میں نے احتیاط سے بال برش سے نکال لئے اور پاکٹ میں رکھ لئے۔ اور اس کا دوپٹا جو بیڈ پر تکیے کے ساتھ پڑا تھا اٹھا کر سونگھنے لگا۔ نرس آنٹی نے مجھے دیکھا۔

''اگر تمہارے بھائیوں نے تمہیں رکھ لیا تب تو میں نہیں جانتی کہ وہ اس سامان کا کیا کریں گے لیکن اگر تم مجھے مل گئے تو ہم یہ سامان فروخت کر دیں گے۔ یہ کافی قیمتی فرنیچر ہے اور روپے تمہارے نام سے بینک میں جمع کروا دوں گی۔ اور اپنی مما کی دوسری استعمال کی اشیا تم اپنے پاس رکھ لینا ان کی یاد کے طور پر۔''

میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ میرے اندر ایک گہری چپ اتر آئی تھی اور لمحہ لمحہ یہ چپ زیادہ گہری ہوتی جا رہی تھی حتیٰ کہ جب میں نرس آنٹی کے ساتھ قبرستان گیا اور وہاں مٹی کے اس ڈھیر کو دیکھا جس کے نیچے افزا علوی کا خوبصورت وجود چھپ گیا تھا تب بھی یہ چپ نہ ٹوٹی۔ میں نے قبر کی مٹی پر ہاتھ رکھا تو میرے اندر جیسے زلزلہ آ گیا لیکن میں باہر سے پُرسکون تھا اور میں نے تقریباً سرگوشی میں کہا تھا۔

''مما! میں آپ سے ناراض ہوں۔ مما آپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔''

''بری بات!'' نرس آنٹی نے سن لیا۔ ''تمہاری مما اپنی خوشی سے نہیں گئی ہیں اور کوئی بھی اپنی خوشی سے نہیں جاتا...... لیکن وقت پورا ہو جائے تو جانا ہی ہوتا ہے۔''

میرا دل چاہا کہ میں مٹی اکھیڑ ڈالوں اور مما کو باہر نکال لوں اور ان کے ساتھ لپٹ جاؤں اور میں نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا اور کھڑا ہو گیا۔

''چلیں؟''

''ہاں!''

دعا مانگ کر نرس آنٹی بھی کھڑی ہو گئی۔

ممانے شاید علوی ہاؤس کا پتا بہت اچھی طرح نرس آنٹی کو سمجھا دیا تھا۔ کہ ٹیکسی سیدھی علوی ہاؤس کے گیٹ کے پاس جا کر رکی تھی۔

لاؤنج میں صرف اسمارہ علوی تھی جو ٹی۔ وی دیکھ رہی تھی۔

''مجھے مسز حمید اللہ علوی سے ملنا ہے۔'' نرس نے اسے مخاطب کیا۔

''آپ کون ہیں؟'' اسمارہ علوی نے پوچھا اور ایک اجنبی نظر مجھ پر ڈالی۔ شاید اتنے سالوں بعد وہ مجھے پہچان نہ سکی تھی۔

''آپ مسٹر علوی کی صاحبزادی ہیں؟''

نرس نے جواب دینے کے بجائے پوچھا تو اسمارہ نے سر ہلا دیا تو نرس آنٹی نے کہا۔

''بیٹا! آپ کی والدہ مجھے ذاتی طور پر نہیں جانتیں اور میں بھی غائبانہ ان سے متعارف ہوئی ہوں' مجھے ایک ضروری کام ہے ان سے۔''

اسمارہ رقیہ علوی کو بلانے چلی گئی۔

رقیہ علوی پہلے تو نرس آنٹی کی بات سن کر غصے میں آ گئی۔

''ہم کسی افزا کو نہیں جانتے۔''

پھر اس نے ایک تیز غصیلی نظر مجھ پر ڈالی۔ ''یہ اس کا بیٹا ہے؟''

''صرف اس کا ہی نہیں حمید اللہ علوی کا بھی ہے۔''

نرس آنٹی نے آہستگی سے کہا۔

اور پھر بہت دیر تک دونوں کے درمیان گفتگو ہوتی رہی ...... کبھی کبھی آواز بلند ہو جاتی کبھی آہستہ۔ لیکن میں نے ان کی گفتگو سننے کی کوشش نہیں کی۔

میں شاید کچھ دیر کے لئے گرد و پیش سے بے خبر ہو گیا تھا۔ میرے سامنے ٹی۔ وی لاؤنج کے بیچوں بیچ حمید اللہ علوی گرے پڑے تھے اور آس پاس کھڑے اسمارہ علوی اور نجیب

اللہ علوی چیخ رہے تھے۔ رقیہ علوی تھی جو بین کر رہی تھی اور افزا علوی تھی جو گھٹنوں کے بل حمید اللہ کے ساکت جسم پر ہاتھ رکھے دھواں دھار رو رہی تھی...... بعض منظر کیسے ذہن میں منجمد ہو جاتے ہیں اور کبھی پگھلتے نہیں۔ کبھی مٹتے نہیں۔ پھر نجیب اللہ علوی کی آمد مجھے اس منظر سے باہر لائی۔ وہ اونچی آواز میں رقیہ علوی سے کچھ کہہ رہا تھا۔ جواب میں رقیہ علوی نے کچھ کہا شاید میرے اور افزا علوی کے متعلق بتایا تھا۔

''چلیں جان چھوٹی۔'' ہاتھ جھاڑتے ہوئے اس نے یوں کہا جیسے افزا علوی اس کے لئے کوئی مسلسل بوجھ تھی۔ پھر ایک حقارت بھری نظر مجھ پر ڈالی۔ اور عجب طنزیہ انداز میں مسکرایا اور غصیلی آواز میں نرس کو مجھے واپس لے جانے کو کہا۔

''جاؤ' جا کر کسی یتیم خانے میں ڈال دو۔''

اور میں نے اپنے اندر ایک طمانیت سی محسوس کی۔ شاید میں بہت دیر سے کسی ایسے ہی فیصلے کا منتظر تھا۔

اب مجھے نرس آنٹی کے پاس رہنا ہے جو پل میں ہنستی اور پل میں روتی تھی۔ اور وہاں رہنا یہاں اس اتنے بڑے علوی ہاؤس میں رہنے سے ہزار درجہ بہتر تھا۔ اور یوں بھی مجھے یہاں رہنے والوں سے خوف آتا تھا۔

میں نے کھڑے نرس آنٹی کی طرف دیکھا اور کہا۔

''آیئے!'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''چلو'' میں نے دیکھا' اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور خوشی اس کی آنکھوں سے جھلکی پڑتی تھی۔ اس نے افزا علوی کے ساتھ کیا ہوا وعدہ نباہ دیا تھا۔ اور مجھے یہاں لے آئی تھی۔ ان لوگوں نے مجھے اپنے ساتھ نہیں رکھا تھا۔ لہٰذا اب وہ آزاد تھی کہ مجھے اپنے ساتھ رکھ سکے۔ میں آگے بڑھا تو نجیب اللہ علوی نے جان بوجھ کر ایک پاؤں آگے بڑھا دیا اور میں ٹھوکر

کھا کر گر پڑا' میری ناک نیچے کارپٹ پر لگی اور اس سے خون کے قطرے بہنے لگے۔ نرس آنٹی نے فوراً اپنے دوپٹے سے میری ناک سے بہنے والے خون کو پونچھا اور خشمگیں نظروں سے نجیب اللہ علوی کو دیکھا جو انجان سا بنا کھڑا تھا۔ اس سے میں نے اپنے اندر نفرت کی۔ ایک آگ سی بھڑکتی محسوس کی اور یہ نفرت نجیب اللہ علوی کے لئے تھی۔

''آج رات ہم اس گھر میں رہیں گے۔ میں صبح ڈیوٹی پر جاؤں گی تو تم اسکول چلے جانا۔ میں تمہارے سر جان سے کہہ دوں گی کہ تم کو میرے آنے تک وہاں ہی رکھیں' تم چھٹی کے بعد سر جان کے کوارٹر میں چلے جانا۔ تمہاری ما چند دن پہلے سر جان سے ملی تھیں اور انہوں نے تمہارے متعلق ان سے بہت ساری باتیں کی تھیں۔ اور تم سے کہا تھا کہ تم ہمیشہ وہی کرنا اور ویسا ہی کرنا جیسا کہ سر جان تم سے کہیں۔ سر جان نے تمہاری ما سے وعدہ کیا ہے کہ جب تک وہ یہاں ہیں پاکستان میں وہ تمہاری تعلیم کا پورا خیال رکھیں گے۔ بلکہ انہوں نے ہمیشہ کے لئے تمہاری تعلیمی ذمہ داری کو قبول کیا تھا۔''

میں غم زدہ تھا' افسردہ تھا۔ لیکن اس بات سے مطمئن بھی تھا کہ اب مجھے علوی ہاؤس میں نہیں رہنا۔

''پھر میں دو تین دن کی چھٹی لے لوں گی اور ہم تمہارے سامان کا کچھ کریں گے۔ گھر خالی کرنا ہے۔''

اس رات نرس آنٹی نے مجھ سے اپنے گاؤں کی اور اپنے بچپن کی بہت ساری باتیں کیں۔ ہم کئی بار روئے اور پھر چپ ہو گئے۔ میں افزا علوی کے بیڈ پر ان کے تکیے سے لپٹ کر سو گیا۔ اور نرس آنٹی کے سونے کے بعد کتنی ہی دیر تک چپکے چپکے روتا رہا' اور پاکٹ سے اس کے بال نکال کر دیکھے۔ جو میں نے برش سے نکال کر ایک کاغذ میں لپیٹ کر اپنے پاس رکھ لئے تھے۔ صبح ہم سکول گئے اور۔۔۔۔۔۔

سر جان افزا کی ڈیتھ کا سن کر بہت دیر تک افسوس کا اظہار کرتے رہے' اور انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ میرے ہر طرح کے تعلیمی اخراجات فیس کے علاوہ بھی وہ ہی برداشت کریں گے۔ ''میں تمہیں پسند کرتا ہوں اینگ بوائے تم ایک ذہین لڑکے ہو اور تمہاری ذہانت کو ضائع نہیں ہونا چاہئے۔۔۔۔۔۔ اور تم بہت بہادر ہو' اب تمہیں اپنے ماں باپ کے بغیر زندہ رہنا ہے تنہا۔۔۔۔۔۔ تم چاہو تو میرے پاس میری ریزیڈنسی میں رہ سکتے ہو۔''

''نہیں۔۔۔۔۔۔ یہ میرے پاس رہے گا' اس کی مما نے مجھ سے کہا تھا۔'' نرس آنٹی فوراً بول اٹھی۔ اور سر جان مسکرا دیے۔

''او کے نائس لیڈی!''

♥ ♥ ♥ ♥

ہم نرس آنٹی کے کوارٹر میں آ گئے تھے۔ میں نے مما کی چیزیں سنبھال کر ایک اٹیچی میں رکھ لی تھیں۔ مالک مکان نے نرس آنٹی سے کہا تھا وہ پہلی تک مکان کی چابی اپنے پاس رکھ سکتی ہے...... کوارٹر میں ایک کمرہ تھا ایک ساتھ' کچن اور چھوٹا سا اسٹور برآمدہ اور صحن ......برآمدے میں چق ڈال کر ایک چار کرسیوں والی گول ڈائننگ ٹیبل ڈال دی گئی تھی۔

کمرے میں دو لوہے کے ہاسپٹل والے بیڈ تھے...... نرس آنٹی نے میرا سامان اسٹور میں رکھ دیا تھا اور کمرے سے دو کرسیاں اور ٹیبل اٹھا کر اسٹور میں رکھ کر وہاں چارپائی بچھا کر میرے لئے جگہ بنائی تھی۔

''یہاں اس ٹیبل کو تم اپنی رائیٹنگ ٹیبل کے طور پر استعمال کر لینا......''

نرس آنٹی نے برآمدے میں بچھی ڈائننگ ٹیبل کی طرف اشارا کرتے ہوئے کہا اور خود کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی اور مجھے بھی بیٹھنے کا اشارا کیا۔ دوسری نرس آنٹی کچن میں گھسی کچھ بنا

رہی تھی۔ نرس آنٹی نے مجھے بتایا کہ وہ تمہارے لئے انڈوں کا حلوہ بنا رہی ہے۔ اور آج رات کا سارا کھانا اس نے تیار کیا ہے۔

''ابھی شاید تمہیں تھوڑی سی مشکل ہو' یہ گھر چھوٹا ہے لیکن جب تم تھوڑے اور بڑے ہو جاؤ گے تو ہم ذرا بڑا گھر کرائے پر لے لیں گے۔ ابھی یہاں صبح ہے' کبھی میری رات کی ڈیوٹی ہوتی ہے اور کبھی دن کی۔ تم ابھی چھوٹے ہو' اکیلے نہ رہ سکو گے۔ یہاں زیادہ سیف ہے...... جب میری رات کی ڈیوٹی ہو تو نسیم ہوتی ہے گھر پر اور اگر نہ ہو تب بھی یہاں ہاسپٹل کے اندر ڈر نہیں ہے کوئی ...... میں رات میں چکر لگا سکتی ہوں۔'' نرس آنٹی نے مجھے بتایا۔

''سونو! تمہیں نوڈلز پسند ہیں۔ میں تمہارے لئے نوڈلز ود پران بنانے لگی ہوں۔''

نسیم آنٹی نے کچن سے پوچھا' تب ہی دروازے پر دستک ہوئی اور آنے والے شخص کو دیکھ کر نرس آنٹی ہی نہیں میں بھی حیران رہ گیا۔ وہ نجیب اللہ علوی تھا۔

''میں سکندر کو لینے آیا ہوں۔'' میرا دل یکدم جیسے اتھاہ گہرائیوں میں گر گیا۔

''لیکن کیوں؟'' بے اختیار نرس آنٹی کے ہونٹوں سے نکلا۔

''اس لئے کہ یہ میرے باپ کی اولاد ہے اور میری مجبوری ہے کہ اب جبکہ وہ غاصب عورت زندہ نہیں رہی تو اسے گھر پر رکھوں' مجھے میری ماں نے بھیجا ہے کہ اسے لے آؤں۔''

پتا نہیں انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیوں کیا تھا۔ تب میں بالکل نہیں جانتا تھا..... ہاں میں یہ ضرور جانتا تھا کہ علوی ہاؤس میں میرے لئے محبت نہیں ہے اور میں وہاں خوش نہ رہ سکوں گا۔ لیکن یہ افزا علوی کا حکم تھا کہ مجھے وہاں ہی رہنا ہے۔

نرس آنٹی بھی قول ہار چکی تھی افزا علوی کے سامنے۔ اس نے آخری لمحوں میں وعدہ کیا تھا افزا علوی سے' اسے نبھانے کے لئے اس نے خاموشی سے سر جھکا دیا۔ لیکن میں نے دیکھا اس کی رنگت پھیکی پڑ گئی تھی اور آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔

''سونو! تم مجھ سے ملنے آیا کرو گے نا؟''

اور میں نے وعدہ کرلیا۔

انہوں نے آنکھوں میں آئے آنسو چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اور گھر کی چابیاں نجیب اللہ علوی کے حوالے کردی تھیں۔ کہ سامان اٹھوا کر چابیاں مالک مکان کو دے دی جائیں...... مجھے نہیں معلوم کہ وہ سامان کیا ہوا اور نجیب اللہ علوی نے اس کا کیا کیا لیکن وہ اٹیچی کیس جس میں مما کے کپڑے تھے اور میرا بیگ نرس آنٹی نے نجیب اللہ کی گاڑی میں رکھوا دیا تھا جسے چوکیدار نے علوی ہاؤس پہنچ کر اس کمرے میں رکھ دیا جس میں مجھے رہنا تھا...... یہ کمرہ دراصل گیراج تھا۔ لیکن گیراج کے طور پر استعمال نہیں ہوتا تھا۔ میرے آنے سے پہلے عموماً دن میں چوکیدار اس میں لیٹا رہتا تھا۔ کمرے میں ایک بان کی چارپائی تھی اور ایک تکیہ پڑا تھا۔ بستر کے نام پر صرف ایک دری تھی۔

''تمہیں یہاں رہنا ہے..... اور بلا ضرورت تم اندر کوٹھی میں نہیں آؤ گے۔''

نجیب اللہ کی آواز میں' مجھے ایک سانپ کی سی پھنکار آئی۔

''تمہیں کھانا وغیرہ یہاں ہی مل جایا کرے گا۔''

لان میں کام کرتے مالی نے مجھے ہمدردی سے دیکھا۔ میں حیران تھا کہ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے..... میں نے اس کمرے کو دیکھا...... ایک لمحہ کو میرا جی چاہا کہ میں واپس نرس آنٹی کے پاس چلا جاؤں' لیکن پھر مجھے افزا علوی کی یاد آئی۔

''تم ایک بہادر بچے ہو سونو! مشکلات سے نہ گھبرانا۔ ہمت نہ ہارنا.....''

کاش! افزا علوی مجھ پر بہادر ہونے کا لیبل نہ لگاتی تو...... میں ابھی وہاں ہی کھڑا نجیب اللہ کی تحقیر آمیز نظریں اپنے اندر اترتے محسوس کر رہا تھا کہ رقیہ علوی اور اس کے پیچھے اسمارا علوی اور مجیب اللہ علوی تینوں ہی باہر آگئے۔

''تو تم آگئے؟'' رقیہ علوی نے بھنویں اچکائیں۔

''ہم نے تم پر ترس کھا کر یہاں بلا لیا ہے۔ اسے ہمارا احسان سمجھو۔''

سب ہی مجھے حقارت اور تمسخر سے دیکھ رہے تھے۔ میں خاموش رہا۔

''تو تمہاری ماں مرگئی...... ڈائن''۔

رقیہ علوی پورچ کی سیڑھیوں سے نیچے اتر کر میرے سامنے آ کھڑی ہوئی......

''ایسوں کا ایسا ہی انجام ہوتا ہے۔ میرے سہاگ پر ڈاکہ ڈالا تھا.... نہ سہاگ رہا نہ خود۔''

رقیہ علوی کی ہنسی میں کچھ عجیب سا تھا۔ میرے اندر روح میں اس کی باتوں سے کہیں کوئی تکلیف' کوئی اذیت ہو رہی تھی۔ لیکن میں ساکت کھڑا تھا۔ پھر وہ سب واپس اندر چلے گئے اور وہ اذیت ہولے ہولے میرے پورے وجود میں پھیل گئی۔ اور اس اذیت سے گھبرا کر میں رونے لگا۔ میں بہت دیر تک روتا رہا۔

♥ ♥ ♥ ♥

پہلی رات جو میں نے اس گیراج میں گزاری وہ بہت مشکل تھی.... خوف سے مجھے ایک پل بھی نیند نہ آئی..... جتنی سورتیں اور آیات مجھے یاد تھیں' وہ سب میں نے پڑھ ڈالی تھیں۔ اور کھیس لپیٹ کر سونے کی کوشش کی تھی لیکن نیند نہیں آتی تھی۔

پتا نہیں رات کب گزری تھی اور صبح کب ہوئی تھی' صبح اٹھ کر میں بہت دیر تک اپنے بیڈ پر ہی بیٹھا رہا۔ بیڈ کیا تھا۔ چارپائی جس پر صرف ایک دری' تکیہ اور کھیس پڑا تھا۔ مجھے کیا کرنا ہے میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ مجھے اسکول بھی جانا تھا..... سرجان نے کہا تھا میں بالکل چھٹی نہ کروں..... اور باقاعدگی سے اسکول آؤں۔ رات سے میں نے کچھ کھایا بھی نہیں تھا۔

میرے دل میں یکدم غصہ بھرنے لگا...... یہ غصہ سب سے زیادہ افزا علوی کے لئے تھا۔

آخر افزا علوی نے یہ کیوں کہا کہ مجھے یہاں رہنا ہے۔

میں تو کہیں بھی رہ سکتا تھا۔ سرجان کے پاس نرس آنٹی کے پاس۔

غصے کے ساتھ ہی مجھے رونا آ گیا۔ کچھ دیر تک میں روتا رہا..... پھر اٹھا اور گیراج سے باہر نکلا۔ سائیڈ پر ایک واش روم تھا۔ چوکیدار ڈرائیور مالی وغیرہ کے لئے میں نے وہاں جا کر منہ ہاتھ دھویا اور پھر اپنے بیگ سے آ کر یونیفارم نکالا۔ اپنا بیگ اور اٹیچی دھکیل کر چارپائی کے نیچے کر دیے۔ اور پھر مما کی اشیا والا اٹیچی کھولا اور اس میں سے کچھ روپے نکال لئے۔ مما کے پرس میں چھ سات سو روپے تھے۔ جو نرس آنٹی نے آتے ہوئے مجھے دے دیے تھے۔ میں یونیفارم بدل کر اور بیگ اٹھا کر باہر نکل آیا۔ چوکیدار نے مجھے دیکھا اور پوچھا۔

''اسکول جا رہے ہو؟''

''ہاں۔''

''تمہارے ماں باپ کہاں ہیں۔ کیا تم صاحب کے گاؤں سے آئے ہو یہاں پڑھنے۔''

''میں حمید اللہ علوی کا بیٹا اور نجیب اللہ علوی کا سوتیلا بھائی ہوں۔''

چوکیدار نے اس دوران گیٹ کھول دیا تھا میں اسے حیران چھوڑ کر باہر نکل آیا۔

باہر نکل کر میں کچھ دیر کھڑا رہا میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے کس سمت جانا ہے اسٹاپ کہاں ہے اور کیا نزدیکی اسٹاپ سے مجھے اپنے اسکول کے لئے ویگن مل جائے گی..... مجھے کچھ پتا نہیں تھا۔ میں کچھ دیر چلتا رہا اور پھر ایک رکشے کو روکا.......

''مجھے امریکن گرامر اسکول جانا ہے' کتنے پیسے لو گے۔''

''بیس روپے۔''

مٹھی میں پکڑے ہوئے پیسوں میں سے بیس روپے نکال کر میں نے رکشے والے کو دیے اور خود گیٹ میں داخل ہو گیا۔ ابھی زیادہ بچے نہیں آئے تھے۔ اسمبلی اسٹارٹ ہونے میں

وقت تھا۔ میں نے بیگ کلاس روم میں رکھا اور لان کو کراس کرتا ہوا ہاسٹل کی عمارت کی طرف چلا اور پھر وہاں سے ٹیچرز کی اقامت گاہوں کی طرف مڑ گیا۔ سرجان غالباً تیار تھے اور اپنی ریزیڈنسی کے باہر کھڑے تھے۔ مجھے دیکھ کر حیران ہوئے۔

''ہیلو ینگ بوائے ہاؤ آر یو۔''

''فائن سر!'' میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''اندر آ جاؤ۔'' وہ مجھے اپنے ساتھ اندر لے گئے۔

''ناشتہ کیا؟''

غیر ارادی طور پر میرا سر نفی میں ہل گیا۔ حالانکہ میں سرجان کو ہرگز یہ بتانا نہیں چاہتا تھا کہ میں بھوکا ہوں۔

''او کے...... خان۔''

انہوں نے اپنے کک کو آواز دی۔ ''سکندر بابا کے لئے بریک فاسٹ فوراً تیار کرو۔''

''کہاں سے آ رہے ہو اور مٹھی میں کیا ہے؟''

میں نے مٹھی کھول دی۔ پسینے سے بھیگے ہوئے چند نوٹ تھے۔

''وہ رکشے کا کرایہ دیا تھا بقایا پیسے ہیں۔'' میں نے ساری تفصیل بتائی۔

''تم بہادر لڑکے ہو تمہیں ڈرنا نہیں چاہئے۔''

میں خاموش بیٹھا لب کاٹتا رہا۔ سرجان ہولے ہولے بولتے رہے سمجھاتے رہے۔

''اوپر آسمانوں پر رہتا خدا بہت مہربان ہے۔ یسوع مسیح کا خدا اور ہمارا خدا۔ تم گھبرانا نہیں، ڈرنا نہیں بالکل بھی۔ یہ تمہاری ماما کی خواہش تھی کہ تم اپنے خاندان میں رہو..... لیکن کبھی بہت گھبرا جاؤ تو یہاں آ جانا۔ میرے پاس۔''

پھر ناشتہ کرتے ہوئے وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔

''دنیا میں بہت سارے لوگ تمہاری طرح رہ جاتے ہیں اکیلے اور زندگی سے جنگ لڑتے ہیں۔ تمہیں بھی سروائیو کرنا ہے۔ زندہ رہنا ہے اور پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بننا ہے۔''

سرجان کی باتوں سے مجھے حوصلہ ہوا تھا اور میرے اندر کا غصہ اور رنج کچھ کم ہو گیا تھا۔ اس روز چھٹی کے وقت سرجان اپنی گاڑی پر مجھے گھر چھوڑنے آئے تھے۔

''اس طرح میں تمہارا گھر دیکھ لوں گا' کبھی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے اور تمہیں راستوں کا بھی سمجھا دوں گا''۔ پھر انہوں نے مجھے گھر سے نزدیک ترین اسٹاپ دکھایا جہاں سے اسکول کے لئے مجھے ویگن یا بس مل سکتی تھی اور وہ اسٹاپ بھی بتایا جہاں سے اسکول سے واپسی پر مجھے ویگن ملتی۔ جب انہوں نے علوی ہاؤس کے گیٹ کے پاس اتارا اور ابھی میں مین گیٹ کھلوانے کے لئے بیل پہ ہاتھ رکھا ہی تھا کہ گیٹ کھلا اور نجیب اللہ علوی باہر نکلا مجھے دیکھتے ہی اس کا رنگ سرخ آنکھیں انگارہ ہو گئیں اور وہ غصے سے پھنکارا۔

''کہاں مر گئے تھے؟''

اور ساتھ ہی الٹے ہاتھ سے میرے رخسار پر تھپڑ مارا۔

''کس سے اجازت لے کر گھر سے باہر قدم نکالا تھا۔'' اس نے پھر ہاتھ اٹھایا اور اس سے پہلے کہ اس کا تھپڑ میرے رخسار پر لگتا پیچھے سے سرجان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

غالباً مجھے مارتے دیکھ کر وہ گاڑی سے اتر آئے تھے۔

انہوں نے ایک جھٹکا دے کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

''کون ہو تم؟'' نجیب اللہ غصے سے ان کی طرف مڑا۔

''مجھے آپ کو اپنا بائیو ڈیٹا بتانے کی ضرورت نہیں ہے لیکن ایک معصوم بچے پر ہاتھ اٹھاتے آپ کو شرم آنا چاہئے۔''

''یہ معصوم بچہ میرا بھائی ہے۔''

''بھائی!'' سرجان استہزائیہ انداز میں ہنسے۔'' تب ہی گھر کے گیراج میں رات

سے بھوکا پیاسا پڑا ہے۔'' نجیب اللہ ذرا سا شرمندہ ہوا'' یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے آپ جائیں اپنا راستہ ناپیں۔''

''یہ آپ کا ذاتی معاملہ نہیں ہے۔..... اگر اس کے ساتھ زیادتی ہوگی تو میں مداخلت کروں گا کیونکہ یہ میری صرف اخلاقی ذمہ داری ہی نہیں بلکہ اس بچے کی والدہ مجھے اس کا خیال رکھنے کو کہہ گئی ہے اور میں اس کا ٹیچر ہوں۔ مجھے آپ سے صرف یہ کہنا تھا کہ اس بچے کی پڑھائی کسی صورت متاثر نہ ہو...... ورنہ......''

اور اپنی بات مکمل کیے بغیر سرجان واپس اپنی گاڑی میں جا کر بیٹھ گئے۔ اب پتا نہیں یہ سرجان کی شخصیت کا اثر تھا یا وہ ان سے ڈر گیا تھا کہ مزید کچھ کہے بغیر وہ مجھے گھورتا ہوا اندر چلا گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر چلا گیا۔ اور گیراج میں آکر کپڑے تبدیل کیے اور چارپائی پر بیٹھ گیا میرا ذہن بالکل خالی تھا۔

تین بجنے والے تھے اور بھوک ایک بار پھر مجھ پر حملہ آور ہو رہی تھی۔ تب ہی رقیہ علوی، مجیب اللہ اور نجیب اللہ آگے پیچھے گیراج میں آئے۔ وہ تینوں چارپائی کے سامنے کھڑے ہو کر اس طرح مجھے دیکھنے لگے جیسے میں کوئی عجوبہ ہوں۔

''کون تھا وہ شخص؟'' کچھ دیر بعد نجیب اللہ نے پوچھا۔

''میرے ٹیچر تھے۔''

''کیوں لائے تھے انہیں ساتھ؟'' اب کے مجیب اللہ نے سوال کیا۔

''مجھے راستوں کا علم نہیں تھا۔ چھوڑنے آئے تھے اور راستہ بتانے۔''

''وہ تمہاری ڈائن ماں کو کیسے جانتا ہے۔'' میری کنپٹیاں جل اٹھیں لیکن جب میں بولا تو میرا لہجہ نارمل تھا۔

''ماما مجھے اسکول چھوڑنے جاتی تھیں اور ان سے ملاقات ہو جاتی تھی..... پیرنٹس میٹنگز پر بھی ملاقات ہوتی تھی اور وہ پاپا کے دوست بھی تھے۔''

یہ جملہ میں نے اپنے پاس سے گھڑا تھا۔ حالانکہ سرجان پاپا سے صرف ایک بار ہی ملے تھے۔

تینوں نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

''کل سے تم اسکول نہیں جاؤ گے۔'' اب کے رقیہ بیگم نے کہا۔

''نہیں میں اسکول جاؤں گا۔''

میں نے خود کو مضبوط کیا۔ مجھے پڑھائی نہیں چھوڑنا تھی چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ یہ مجھے سرجان نے کہا تھا۔ اور اگر وہاں رہ کر تمہارے لئے یہ ممکن نہ ہو تو تم میرے پاس چلے آنا۔ میرے لہجے میں شاید میرے عزم کی جھلک تھی یا جانے کیا تھا کہ نجیب اللہ علوی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ماں کو اشارہ کیا اور پھر وہ تینوں یکے بعد دیگرے باہر نکل گئے۔ کچھ دیر بعد ملازم ٹرے میں کھانا رکھ کر لے آیا۔ میں نے خاموشی سے کھانا کھایا..... میں حمید اللہ علوی کا بیٹا تھا..... لیکن گیراج میں بیٹھا ملازموں کی طرح کھانا کھا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہی ملازم پھر آیا۔

''بیگم صاحبہ نے کہا ہے کہ اپنا سامان اٹھا کر اندر آجائیں۔''

پھر اس نے سامان اٹھانے میں میری مدد کی۔ لاؤنج میں سے جو سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں ان کا دروازہ کھول دیا گیا تھا۔ اور گلی کی طرف جو سیڑھیاں بنائی گئی تھیں۔ انہیں لاک کر دیا گیا تھا۔ میں ملازم کے پیچھے پیچھے بیگ گھسیٹتا ہوا اوپر پہنچا۔ اسٹور کا دروازہ کھلا تھا۔ ملازم نے مجھے بتایا کہ یہ میرا کمرہ ہے...... آئندہ سے مجھے یہاں رہنا ہے۔ میں نے اسٹور کے شیڈ پر دونوں اٹیچی کیس اور بیگ رکھے۔ یہاں ایک سنگل بیڈ لگا تھا۔ جس پر صاف ستھری چادر بچھی تھی۔ میں کچھ حیران سا اسٹور سے باہر نکل آیا۔

چند سال پہلے تک میں یہاں افزا علوی اور حمید اللہ علوی کے ساتھ رہتا تھا، ساری یادوں نے مجھ پر یلغار کر دی۔ میں جب یہاں سے گیا تھا تو سات آٹھ سال کا تھا اور اب

گیارہ سال کا۔لیکن پھر بھی کئی منظر میری آنکھوں کے سامنے زندہ ہو گئے تھے۔ میں یکدم بہت بے چین اور مضطرب ہو گیا تھا۔ میں وہاں ہی بیڈ روم کے دروازے کے پاس نیچے کارپٹ پر بیٹھ گیا۔اور اپنا سر گھٹنوں پر رکھ دیا۔ پانی کناروں سے باہر آ گیا تھا۔ پتا نہیں کتنی دیر تک میں اسی کی کیفیت میں بیٹھا رہا۔روتا رہا۔ پھر اسی ملازم لڑکے نے آ کر مجھے کہا کہ مجھے بیگم صاحب بلا رہی ہیں۔ وہ لڑکا تقریباً میرا ہم عمر تھا اور اس کا نام لطیف تھا۔ میں نے اپنے آنسو پونچھے اور اس کے ساتھ نیچے آ گیا۔ رقیہ علوی غالباً صوفے پر بیٹھی میرا ہی انتظار کر رہی تھی۔ میں اس کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

''ہم نے تم پر ترس کھا کر رکھ لیا ہے تمہیں۔'' اس نے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''یہ گھر اور اس گھر کی ہر چیز کے مالک میرے بیٹے ہیں۔ کسی غلط فہمی میں مت رہنا..... حمید اللہ صاحب نے جو کچھ دینا تھا وہ زندگی میں ہی اس چڑیل کو دے دیا تھا۔''

میرے اندر کہیں ہلچل ہوئی' میرا جی چاہا کہ میں اس کا منہ توڑ دوں لیکن میں خاموش کھڑا رہا۔

''تمہیں ہمارا احسان مند ہونا چاہئے کہ ہم نے لاوارث جان کر تمہیں یہاں رکھ لیا ہے۔تم اسکول سے آ کر لطیف کا ہاتھ بٹاؤ گے اور جو بھی چھوٹا موٹا کام ہوا کرو گے۔ یہ ہمارا ایک اور احسان ہے تم پر کہ ہم نے تمہیں اسکول جانے سے منع نہیں کیا۔لیکن ہم تمہاری فیس یا اسکول کے اخراجات کے ذمہ دار نہیں ہیں۔''

شاید سرجان کی وجہ سے انہوں نے پڑھائی نہیں چھڑوائی تھی۔

رقیہ علوی نے اس کے علاوہ بھی بہت ساری ہدایات دی تھیں۔ سو میں یہاں رہنے لگا تھا.....

♥ ♥ ♥ ♥

یہ میری زندگی کا ایک تکلیف دہ دور تھا۔ جو تقریباً آٹھ سال پر محیط تھا۔ یہ آٹھ سال میں نے جس اذیت میں گزارے انہیں بیان کرنا مشکل ہے۔اس اذیت نے میرے تمام وجود کو نیلا کر دیا ہے اور اس زہر نے میری ذات و شخصیت میں بہت ساری گرہیں ڈال دی ہیں۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے میری رگوں میں سرخ لہو کے بجائے کسی خطرناک زہر کا سیال ہے جو ہر لمحہ میرے وجود کو نیلا کرتا رہتا ہے۔ان آٹھ سالوں کے ایک ایک لمحے کی روداد بہت طویل اور اذیت ناک ہے لیکن مختصراً یوں سمجھ لیں کہ میں صبح سویرے اٹھ کر کچن میں جا کر سب کے لئے بیڈ ٹی بناتا۔ ان کے بیڈ رومز میں پہنچاتا۔ میرے یہاں آنے کے کچھ عرصہ بعد ہی رقیہ علوی نے لطیف کو نکال دیا تھا اور مجھ سے کہا تھا کہ وہ سارے کام جو پہلے لطیف کرتا تھا وہ میں کروں گا۔لطیف کے علاوہ اندر کچن میں نسرین بھی کام کرتی تھی۔ وہ البتہ بدستور موجود تھی۔

عموماً نجیب اللہ صبح سویرے مجھے ایک آدھ تھپڑ یا مکا مارتا...... کوئی غلیظ گالی دیتا۔

مجیب اللہ بھی بھائی سے کسی طرح کم نہ تھا۔ سب لوگ دیر سے ناشتہ کرتے تھے اور مجھے جلدی جانا ہوتا تھا اس لئے میں رات کی بچی روٹی گرم کر کے چائے کے ساتھ کھا کر اسکول چلا جاتا اور پھر واپس آکر برتن دھوتا۔ رقیہ علوی عموماً سب کو کھانا دینے کے بعد مجھے کھانا دیتی...... میں خاموشی سے کھالیتا تھا...... اور رات تک نیچے ہی کسی نہ کسی کام میں لگا رہتا۔

عموماً رات کے برتن دھوکر اور کچن صاف کر کے میں سونے کے لئے اوپر جاتا تھا..... پھر صبح تک میں آزاد ہوتا ...... پڑھتا......

رقیہ علوی اور اسارہ سمیت سب ہی باری باری میری عزت نفس کو مجروح کر کے خوش ہوتے تھے۔

نجیب اللہ اکثر اپنے پاؤں آگے کر کے حکم دیتا کہ میں اس کے جوتے صاف کروں۔ اور جوتا صاف کرتے کرتے اچانک ہی اس کے بوٹ کی ٹو کبھی میرے چہرے پر لگتی کبھی سینے پر..... کبھی کبھی وہ مجھ پر تھوک دیتا۔ ہفتے میں دو تین بار دونوں بھائی میری پٹائی کر دیتے، رقیہ علوی کسی معمولی بات پر ڈانٹ ڈپٹ کر کھانا بند کر دیتی۔ میں کبھی کبھی بہت حیران ہوتا کہ آخر یہ سب مجھ سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں۔

میری رگوں میں بھی وہی خون دوڑ رہا ہے جو ان کی رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ اور پھر اگر یہ سب مجھ سے اتنی ہی نفرت کرتے تھے تو پھر مجھے یہاں کیوں لائے تھے۔ لیکن مجھے کبھی اپنے اس سوال کا جواب نہیں ملا۔

ہاں ایک بار سرجان نے کہا تھا۔ کہ شاید تمہارے ان بھائیوں کو یہ خوف رہا ہو کہ تم باہر رہ کر کہیں اپنے حصے کا مطالبہ نہ کر دو۔ یا پھر ان کے لئے کوئی پرابلم نہ کھڑی کر دو۔"

بہر حال جو کچھ بھی تھا۔ میرا تعلیمی سلسلہ چلتا رہا۔ اگرچہ کئی بار اس میں رکاوٹیں ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ ایک بار مجھ پر الزام لگایا گیا کہ میں اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لئے چوریاں کرتا ہوں.... یہ تو سرجان تھے جنہوں نے سارا معاملہ کلیئر

کیا...... میری حیثیت گھر کے ملازم سے بھی بدتر تھی۔ میری یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ قصور تو حمید اللہ علوی نے کیا تھا۔ ان سب کا مجرم وہ تھا لیکن نفرت میرے حصے میں کیوں آئی۔ ہولے ہولے مجھے حمید اللہ علوی اور افزا علوی اپنے مجرم لگنے لگے رات کو جب میں لیٹتا تو تصور میں سب کو کٹہرے میں کھڑا کرتا اور ہر ایک پر فرد جرم عائد کرتا چلا جاتا تو ان مجرموں کے کٹہرے میں حمید اللہ علوی اور افزا علوی بھی ہوتے اور میں ان کی فرد جرم بھی ان کے ہاتھ میں پکڑا دیتا۔

اگرچہ میری شخصیت عجیب و غریب سی ہو گئی تھی بہت مسخ اور بہت سی نفسیاتی گرہیں اندر ہی اندر پڑ گئی تھیں، لیکن حیرت انگیز طور پر میرا تعلیمی سلسلہ صحیح جا رہا تھا اور میں امریکن گرامر اسکول کا بہترین اسٹوڈنٹ تھا۔ شاید اس کی وجہ سرجان کا التفات اور ان کی توجہ تھی...... میں سرجان کو مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر سرجان نہ ہوتے تو شاید میں کبھی خودکشی کر لیتا۔

کئی بار ایسا ہوا کہ جب نجیب اللہ نے میری انسلٹ کی اور مجیب اللہ نے مجھے ٹھوکریں ماریں تو میرا جی چاہا کہ میں زہر کھا لوں، بجلی کے ننگے تار ہاتھوں میں پکڑ لوں اور افزا علوی اور حمید اللہ سے جا کر سوال کروں کہ کیوں...... ؟ کیوں کیا انہوں نے ایسا؟ لیکن ہر بار سرجان میرے سامنے آ کھڑے ہوتے۔

"لڑکے! تم زندگی کے کسی موڑ پر مجھے مایوس نہیں کرو گے۔ میں تمہیں ہمیشہ بلند اور کامیاب دیکھنا چاہتا ہوں۔ بالکل ایسے ہی جیسے اگر کوئی میرا بیٹا ہوتا تو میں اس کے لئے سوچتا ایسے ہی تمہارے لئے سوچتا ہوں۔ میں ہمیشہ تمہیں اپنے ساتھ رکھ کر خوش ہوتا۔ لیکن میں نہیں چاہتا کہ تمہارا کوئی نقصان ہو۔ اور تم اپنے باپ کی جائیداد سے محروم ہو جاؤ...... ؟

ایسی جائیداد جس نے مجھے ذلیل و خوار کر دیا تھا، لیکن یہ بات میں سرجان کو نہیں سمجھا سکتا تھا جن کا خیال تھا کہ افزا علوی نے اگر مجھے یہاں رہنے کے لئے کہا تھا۔ تو یقیناً کچھ سوچ کر ہی کہا ہوگا۔

اورافزاعلوی نے کیا کیا تھا؟'' میرے کیا نقصان کیے تھے اس کو شاید اس کی خبر ہی نہ تھی۔

رقیہ علوی اکثر مجھ پر الزام لگاتی کہ میں چوری کر کے کچن میں سے کھا لیا کرتا ہوں حالانکہ ایسا ہرگز نہیں تھا میرے اندر اتنی جرات نہ تھی۔ اگر کبھی رقیہ علوی کھانا دینا بھول جاتی تو میں مانگنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ اور ایسا ہفتے میں ایک دو بار ضرور ہوتا تھا کہ رقیہ علوی سب ملازموں کو کھانا بھجوا کر خود آرام کرنے چلی جاتی اور اسے یاد ہی نہیں رہتا کہ مجھے بھی کھانا کھانا ہے۔ اور میں خاموشی سے کچن کی صفائی سے فارغ ہو کر ٹی۔ وی لاؤنج میں بیٹھا رہتا۔ یہ رقیہ علوی کا حکم تھا کہ میں دن میں اپنے کمرے میں نہیں جاؤں گا۔

زندگی یوں ہی گزر رہی تھی۔ ہر دن میرے لئے ایک نئی اذیت لے کر آتا تھا۔

عزیز رشتہ دار رقیہ علوی کی تعریف کرتے جس نے سوکن کے بیٹے کو سینے سے لگا رکھا تھا۔ مہنگے اسکول میں پڑھا رہی تھی اور اپنی اولاد کی طرح چاہتی تھی۔ یہ کوئی میرے دل سے پوچھتا کہ ''علوی ہاؤس'' میرے لئے ایک اذیت کدہ تھا اور میں نہیں جانتا تھا کہ اس اذیت کدے سے میری رہائی کب ہوگی' کبھی ہوگی بھی یا نہیں۔

♥ ♥ ♥ ♥

ان دنوں میں اولیول کا امتحان دے رہا تھا' جب گھر میں اچانک ہی نجیب اللہ علوی کی شادی کے ہنگامے شروع ہو گئے۔ میری زندگی کچھ اور مشکل ہو گئی تھی۔ ایک بار پھر مجھے گیراج میں منتقل کر دیا گیا تھا کیونکہ سرونٹ کوارٹر میں چوکیدار اور اس کی فیملی رہتی تھی۔

نسرین چوکیدار کی بیوی تھی جو کچن کا کام کرتی تھی۔

جب میں افزاعلوی کا اٹیچی کیس سیڑھیوں سے نیچے لا رہا تھا تو وہ کھل گیا اور اس کے کپڑے بکھر گئے۔ اس کا پرس اسکی ساڑھیاں۔

اس کے وہ قیمتی ڈریس جو اس نے حمید اللہ کی وفات کے بعد پہننے چھوڑ دیے تھے۔

رقیہ علوی ٹی۔ وی لاؤنج کے بیچوں بیچ آنکھیں پھاڑے اور منہ کھولے کھڑی تھی۔

میں جھک کر کپڑے اکٹھے کرنے لگا تو اس نے میری پیٹھ پر لات ماری۔

''کمبخت چور ڈاکو..... کہاں سے چرا کر لائے ہو یہ۔''

میرے لئے یہ سب روٹین کی بات تھی' سو میں نے سیدھا ہوتے ہوئے نارمل لہجے میں کہا۔

''یہ مما کی چیزیں ہیں۔'' رقیہ علوی نے ہونٹ سکیڑے۔

''یہ سب گند کس لئے سنبھال کر رکھا ہوا ہے؟''

''نسرین!'' اس نے نسرین کو بلایا۔ ''اٹھا لو یہ سب کپڑے اور سامان تمہارے کام آئے گا۔ اچھے کام والے کپڑے بیٹی کی شادی کے لئے رکھ چھوڑنا۔''

میں ساکت کھڑا رہ گیا میرے اندر اتنی جرات نہ تھی کہ میں منع کرتا یا مما کی کوئی چیز اٹھا کر نشانی کے طور پر رکھ لیتا۔

''اور یہ ذرا اپنا بیگ اور اٹیچی بھی کھولو۔'' انہوں نے حکم دیا۔

بیگ میں کتابیں تھیں اور اٹیچی میں میرے کپڑے تھے۔ ان میں وہ نئے کپڑے بھی تھے جو جونز آنٹی مجھے ہر عید پر بنوا کر دیا کرتی تھی لیکن میں دن میں انہیں نہیں پہنتا تھا البتہ رات کو اپنے اسٹور والے کمرے میں جا کر پہن لیتا۔

''یہ کیا ہے؟'' رقیہ علوی ایک ایک چیز کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ افزا علوی کے سامان میں ایک چھوٹا سا جیولری بکس تھا.... بالکل چھوٹی سی ڈبیا جیسا۔ اسے میں نے اپنے بیگ میں رکھا ہوا تھا اور اس میں افزا علوی کے بال رکھ چھوڑے تھے' وہ بال جو اس صبح جب اس کی ڈیتھ ہوئی تھی میں نے برش سے نکال کر اپنی پاکٹ میں رکھ لیے تھے۔

رقیہ علوی نے ڈبیا کھولی اور پھر یوں ڈر کر نیچے پھینک دی جیسے کوئی سانپ دیکھ لیا ہو۔

''یہ..... یہ کیا ہے۔ تم جادو کرتے رہتے ہو ہم سب پر۔ ضرور ان بالوں پر بھی تم نے کوئی جادو کر کے رکھا ہوگا۔ میں بھی کہوں یہ اسمارا کی منگنی کیوں ٹوٹی ہے۔ مجیب اللہ کو یہ ٹھیکہ کیوں نہیں ملا نئے اسپتال کا اور نجیب اللہ کی گاڑی کا کل ایکسیڈنٹ ہوتے ہوئے بچا..... یہ

ضرور تمہاری کارستانی ہے۔ تم چاہتے ہو گے کہ سب مر کھپ جائیں اور قابض ہو جاؤ ہر شے پر لیکن ایسا سوچنا بھی نہیں.....؟

''یہ میری ماما کے بال ہیں.... میں نے برش سے نکالے تھے۔'' میں نے تفصیل بتائی۔

اور رقیہ علوی کے حکم پر ڈبیا اٹھاتے ہوئے نسرین کا ہاتھ کانپ گیا۔

''پھینک دو اسے آگ میں۔ جانے کیا بک رہا ہے۔''

میں نے ہاتھ آگے کیئے جیسے میں نسرین کو منع کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے وہ ڈبیا لینا چاہتا ہوں۔ لیکن میرا ہاتھ فضا میں ہی معلق رہ گیا اور زبان جیسے کسی نے سی دی۔

آج میں گیراج میں تھا' لیکن مجھے خوف نہیں آ رہا تھا۔ البتہ میرا اندر جیسے خالی خالی ہو گیا تھا۔ جیسے مجھ سے کوئی بہت قیمتی متاع چھن گئی تھی۔ جیسے میں کنگال ہو گیا تھا۔ وہ رات میں نے آنکھوں میں جاگ کر گزاری تھی۔ حالانکہ صبح میرا پیپر تھا لیکن میں نے کتابوں کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ میری حالت یوں ہو رہی تھی جیسے کوئی سب کچھ لٹا کر خالی ہاتھ بیٹھا ہو۔ میرے پیپرز اور نجیب اللہ کی شادی کے ہنگامے ایک ساتھ ہی ختم ہوئے تھے۔ آخری پیپر والے دن میں باوجود خواہش کے سرجان سے نہیں مل سکا تھا۔ حالانکہ سرجان نے مجھ سے کہا تھا کہ میں پیپرز سے فارغ ہو کر ان سے مل لوں۔

لیکن اس روز نجیب اللہ کی بارات تھی اور رقیہ علوی نے مجھے بار بار تاکید کی تھی کہ میں اسکول سے سیدھا گھر آؤں اور گھر کا دھیان رکھوں۔ دلہن کا جہیز آ چکا تھا۔ اور خدانخواستہ کہیں کوئی ڈاکو ہی نہ آ جائیں۔ اور ہماری عدم موجودگی میں سب کچھ لوٹ کر چلتے بنیں۔ سو میں نے سوچا تھا کہ میں ولیمے سے فارغ ہو کر سرجان سے مل لوں گا۔ فرسٹ فلور یعنی اوپر والے پورشن کو نجیب اللہ کے لئے ڈیکوریٹ کیا گیا تھا۔ یہ حمید اللہ علوی اور افزا علوی کا بیڈ روم تھا۔

یہ ولیمے کے اگلے دن کی بات تھی' میں رقیہ علوی کے حکم پر یہ دیکھنے کے لئے اوپر گیا

تھا کہ نسرین اوپر والے کچن میں تو نہیں ہے۔ نسرین کچن میں نہیں تھی۔ فرسٹ فلور پر مکمل خاموشی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب میں کچن میں دھلے برتن سنبھال رہا تھا تو میں نے نجیب اللہ علوی کو لاؤنج میں کھڑے رقیہ علوی سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ گویا نجیب اللہ اور اس کی دلہن نیچے تھے یا جا چکے تھے۔ صبح میں نے اسمارا کو یہ کہتے سنا تھا کہ دلہن بھابھی ناشتے کے بعد میکے جائیں گی۔ نجیب اللہ والے بیڈروم کا دروازہ نیم وا تھا۔ جب میں پہلے پہل آیا تھا تو میرا کتنا دل چاہتا تھا کہ میں اس بیڈروم کو اندر سے دیکھوں دیواروں کو چھو کر ماما اور پپا کا لمس محسوس کروں۔ لیکن اوپر کے سب کمرے لاک رہتے تھے اور جانے کب شاید جب میں اسکول میں ہوتا تھا تب نسرین صفائی کرتی تھی۔

اور اب دروازہ نیم وا تھا اور میں کھنچتا ہوا سا دروازے تک آیا تھا۔ پھر میں نے اسی سوئی سوئی کیفیت میں دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ نجیب اور اس کی دلہن جا چکے ہیں۔ لیکن دلہن تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھی۔ وہ ابھی تک نائٹ ڈریس میں تھی۔ وہ ہڑبڑا کر سیدھی ہوئی اور میں الٹے قدموں پیچھے ہٹا تب ہی نجیب اللہ نے مجھے گردن سے پکڑ لیا..... جانے کب وہ اوپر آیا تھا۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ دبیز کارپٹ پر مجھے اس کے قدموں کی آہٹ بھی سنائی نہیں دی تھی۔

''ایڈیٹ!'' اس کی دلہن چلائی۔ ''اسے تمیز ہی نہیں کہ دروازہ ناک کر کے آتے ہیں۔''

اور پھر نجیب اللہ نے مجھے لاتوں اور گھونسوں پر رکھ لیا۔

''کس کام سے آئے تھے؟'' میرے پاس اس سوال کا جواب نہ تھا۔ شور سن کر رقیہ علوی بھی اوپر آگئی اور ثابت یہ ہوا کہ میں کسی بری نیت سے بیڈروم کی طرف آیا تھا۔ دلہن کا زیور ڈریسنگ ٹیبل پر پڑا تھا شاید اسے چرانے یا پھر کسی اور غلط نیت سے۔

میرے سامنے وہ بیڈروم تھا۔ جہاں میں نے حمید اللہ اور افزا علوی کو ہنستے مسکراتے

دیکھا تھا۔ جہاں جب میرا جی چاہتا تھا میں چلا آتا تھا اور جہاں بیڈ پر بیٹھ کر میں افزا علوی سے کارڈز اور کیرم کھیلتا تھا۔ مختلف منظر میری آنکھوں کے سامنے آ اور جا رہے تھے۔ نئی دلہن حیران سی کھڑی مجھے پٹتے دیکھ رہی تھی۔

شاید اسے اتنے شدید ردعمل کی توقع نہ تھی۔ لیکن اسے کیا خبر تھی کہ یہ ردعمل برسوں پر محیط ہے..... یہ صرف آج کی غلطی کا ردعمل نہیں ہے۔ یہ ردعمل تو اس غلطی کا ہے جو میرے باپ نے کی تھی۔ اور جس کی مرتکب میری ماں ہوئی تھی۔ شاید نجیب اللہ کو بہت رنج ہوا ہو حمید اللہ کی شادی کی خبر سن کر شاید اسے بہت غصہ آیا ہو۔ اسمارا چھپ چھپ کر روئی ہو۔ رقیہ علوی نے سہاگ کی تقسیم مشکل سے برداشت کی ہو شاید وہ سب اپنے اپنے ردعمل میں سچے ہی ہوں گے۔

لیکن میں..... میرا کیا قصور تھا۔ اور اب جو ردِعمل میرے اندر سے باہر آنا تھا اس کی زد میں کون آئے گا۔

پھر شاید دلہن کے کہنے پر نجیب اللہ نے مجھے چھوڑ دیا اور خونی نگاہوں سے مجھے گھورتا ہوا اپنی دلہن کو لے کر اندر چلا گیا اور دروازہ بند کر لیا۔ سارے منظر ایک ایک کر کے غائب ہو گئے اور لمحہ ءموجود کے درد جاگ اٹھے۔ میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔

میرے چہرے پر جگہ جگہ نیل پڑے تھے میری ٹانگیں کئی جگہ سے چھل گئی تھیں جہاں جہاں اس کے بوٹ لگے تھے وہاں وہاں نیل ابھر آئے تھے۔ میں بمشکل اٹھا تھا۔ میرا سر بھی چکرا رہا تھا اور سر میں بھی جگہ جگہ گومڑ پڑے تھے۔ میں سیڑھیوں سے نیچے اترا اور کھلے گیٹ سے باہر نکلتا چلا گیا۔ میں بغیر کوئی راستہ متعین کیے گھر سے نکلا تھا اور اب چلتے چلتے سرجان کی اقامت گاہ پر پہنچ گیا تھا۔

''اوہ ینگ بوائے!'' سرجان نے مجھے تھام لیا۔ اور سہارا دے کر بٹھایا۔ ''میں تمہارا انتظار کر رہا تھا اور تم کہاں چلے گئے تھے اور یہ سب کیا ہے؟''

''یہ سب؟'' میں نے آہستگی سے کہا اور میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں.....

میں اٹھارہ انیس سال کا لڑکا ہاتھوں میں چہرہ چھپائے بچوں کی طرح رو رہا تھا اور سر جان غصے میں اپنے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ وہ میرے بتائے بنا ہی شاید جان گئے تھے کہ میری یہ حالت کس نے کی ہے۔ انہوں نے کچھ دیر مجھے رونے دیا اور پھر آہستگی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھے۔

''یہ آج تمہارے آخری آنسو ہیں۔ اگر تم اور رونا چاہو تو رو سکتے ہو لیکن آج کے بعد میں تمہیں رونے نہیں دوں گا۔''

پھر وہ کچھ دیر کے لئے مجھے کمرے میں اکیلا چھوڑ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

کچھ دیر بعد میں خود ہی آنسو پونچھ کر اور چہرہ صاف کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ غالباً چھوٹے سے ٹی۔ وی لاؤنج میں بیٹھے میرا ہی انتظار کر رہے تھے وہ مجھے دیکھ کر مسکرائے۔

"Now do you feel well" (کیا تم اب بہتر محسوس کرتے ہو؟)

میں نے سر ہلا دیا اور ان کے کچھ پوچھنے سے پیشتر ہی ساری بات کہہ دی۔

''میں نے تمہیں اس لئے بلایا تھا کہ تم سے تمہارا آگے کا پروگرام پوچھوں۔ کیونکہ میں اپنے وطن واپس جا رہا ہوں۔ میں چاہ رہا تھا کہ تمہارے اکاؤنٹ میں کچھ رقم جمع کروا جاؤں تاکہ تمہارے کام آ سکے۔ لیکن اب میں نے فیصلہ بدل دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہیں اپنے ساتھ ہالینڈ لے جاؤں۔ وہاں رہ کر تم اپنی ایجوکیشن مکمل کرو۔ وہاں تم ایجوکیشن کے ساتھ ساتھ جاب بھی کر سکو گے۔ میرے پلان میں یہ تھا کہ تمہیں وہاں بلواؤں گا لیکن میں چاہ رہا تھا کہ تم یہاں سے اپنی گریجویشن مکمل کر لو لیکن اب..... میں تمہیں ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ کیا تم راضی ہو۔''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''میرا کوئی بیٹا نہیں ہے اور تم میرے بیٹے کی طرح ہو سن۔ میری ایک بیٹی ہے لیزا۔ تمہاری ہی عمر کی ہوگی اب۔ میں نے پندرہ سالوں سے اسے نہیں دیکھا۔ وہ تقریباً تین سال کی تھی۔ جب اس کی ماما مجھ سے علیحدہ ہوگئی تھی اور عدالت کے فیصلے کے مطابق اسے اپنی مما کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ اگر میں وہاں رہتا تو شاید اس سے ملتا رہتا لیکن میں اس کے فوراً بعد ہی پاکستان آ گیا تھا۔ یہ جاب مجھے پسند آئی تھی۔ میرے دوست نے مجھے اس کے متعلق لکھا تھا وہ یہاں امریکن سفارت خانے میں ملازم تھا۔ نینسی کی علیحدگی نے مجھے اندر سے توڑ دیا تھا۔ میں نے نینسی سے محبت کی تھی۔ میں علیحدگی نہیں چاہتا تھا لیکن ہمارے درمیان چارلس آ گیا تھا اس کا باس..... سو میں نے اپلائی کیا اور چلا آیا..... لیزا کو میں یہاں سے تحائف بھجواتا رہتا ہوں..... کبھی کبھار فون بھی کر دیتا ہوں۔ وہ پڑھ رہی ہے اور اس کا خیال آرکیٹکٹ بننے کا ہے۔''

سر جان پہلی بار مجھے اپنے اور اپنی ذات کے حوالے سے کچھ بتا رہے تھے۔

''اتنے طویل عرصہ سے ایک غیر ملک' غیر تہذیب میں رہتے رہتے میں کچھ بیزاری سی محسوس کرنے لگا ہوں۔ پھر لیزا سے ملنے کی خواہش بھی بہت شدید ہے۔ میں نے کئی بار اسے کہا کہ وہ اپنی چھٹیوں میں یہاں آئے لیکن وہ کبھی فارغ نہیں ہوتی یا تو اپنے سمسٹر بھگتاتی رہتی ہے۔ یا کہیں جاب کر لیتی ہے۔

آج کل بھی وہ ایک پیٹرول پمپ پر کام کر رہی ہے..... اور کچھ دن پہلے ہی وہ اپنے سمسٹر سے فارغ ہوئی ہے۔ نئے سمسٹر اسٹارٹ ہونے تک وہ یہاں ہی جاب کرے گی۔ سو میں نے ریزائن دے دیا ہے۔ سر پیٹر نے بہت کہا ہے کہ میں لیزا سے مل کر اور کچھ عرصہ اپنے وطن میں رہ کر واپس آ جاؤں..... لیکن میں واپس آنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ کوئی کب تک کسی دوسری تہذیب اور ملک میں رہ سکتا ہے۔ ایک دن اسے اپنی اصل کی طرف لوٹنا ہی ہوتا ہے۔ تمہارا ملک بہت خوبصورت ہے ینگ مین لیکن میرا ملک بھی کم خوبصورت نہیں۔''

اس روز سرجان نے مجھے گرم پانی سے ٹکور کی اور دو پین کلر دے کر سونے کی تاکید کی۔

''اب تمہیں علوی ہاؤس واپس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے تمہاری ماما سے کیا ہوا عہد نبھانے کی بہت کوشش کی ہے اور اپنی حد تک اسے نباہ دیا ہے۔ مردہ لوگوں کی خواہشات زندہ لوگوں کی زندگیوں سے زیادہ اہم نہیں ہوتیں۔ اس لیے کچھ مت سوچو اور چیئر اپ ناؤ۔''

پھر مجھے معلوم نہیں کہ سرجان نے کیسے اور کس طرح مجھے ساتھ لے جانے کا بندوبست کیا۔ مگر سرجان نے ایسا کر لیا تھا اس میں دو ماہ سے زیادہ کا عرصہ لگ گیا تھا۔ اس دو ماہ کے دوران میں سرجان کے ساتھ ہی رہا تھا اور سرجان نے میرے لئے بہت ساری شاپنگ کی تھی۔ اگرچہ میں ایک دن موقع پا کر اپنا سامان گیراج سے اٹھا لایا تھا۔ میں اس وقت گھر گیا تھا جب کسی کے گھر پر ہونے کا امکان نہ تھا۔ یوں بھی میرا سامان گیراج میں تھا۔ سو رقیہ علوی کو خبر بھی نہ ہو سکی کہ میں کب آیا تھا۔

جب تمام انتظام مکمل ہو گئے تو میں نرس آنٹی سے ملنے گیا..... وہ میری کچھ نہیں لگتی تھی، لیکن پھر بھی میرے لئے روتی تھی۔ میرا خیال رہتا تھا اسے۔ میں پتا نہیں اس سے محبت کرتا تھا یا نہیں لیکن وہ مجھ سے اپنے بچوں جیسی ہی محبت کرتی تھی۔ اس نے مجھے قرآن کا تحفہ دیا تھا اور اس طرح نصیحتیں کی تھیں جیسے ایک ماں کرتی ہے۔

''تم ایک کرسچن کے ساتھ جا رہے ہو، اپنا مذہب نہ چھوڑنا..... مذہب ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ اور تم ایک ایسے دین کے ماننے والے ہو جو سب سے سچا دین ہے۔''

وہ بہت دیر تک مجھے سمجھاتی رہی، اس نے مجھے افزا علوی اور حمید اللہ علوی کی قسم دی کہ میں شراب نہیں پیوں گا۔ میں نے اس کی قسم کھائی۔ افزا علوی اور حمید اللہ علوی مجھے اس ظالم دنیا کے حوالے کر کے چلے گئے تھے میں ان سے خفا تھا اس لئے میں نے اس کی قسم کھائی

اور وعدہ کیا کہ چاہے کچھ بھی کروں۔ لیکن شراب کبھی نہیں پیوں گا اور میں نے اپنا وعدہ نبھایا بھی...... بہت سے مواقع ایسے آئے تھے جب میرا دل چاہا تھا کہ خود کو شراب میں گم کر دوں لیکن نرس آنٹی کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا تھا۔ جو پل میں روتی اور پل میں ہنستی تھی اور میں اپنے ارادے سے باز آ جاتا۔

نرس آنٹی نے مجھے تاکید کی تھی کہ میں وہاں جا کر نماز باقاعدگی سے پڑھوں اور جب بھی وقت ملے قرآن پڑھا کروں۔

سچ تو یہ ہے کہ جب سے افزا علوی کا انتقال ہوا تھا نہ تو میں نے قرآن پڑھا تھا اور نہ ہی نماز۔ حالانکہ جب افزا علوی زندہ تھی تو وہ صبح سویرے نماز پڑھنے کے بعد مجھے بھی اٹھا دیتی تھی اور ناشتے سے پہلے مجھ سے قرآن کا ایک رکوع ہر روز ضرور سنتی تھی، اس کا خیال تھا کہ نہیں تو میں بھول جاؤں گا کیونکہ ابھی میں نے صرف دو بار ہی قرآن ختم کیا تھا۔ جب میں نے قرآن ختم کر لیا تو پھر گھر میں ہی پڑھنے لگا تھا۔ کیونکہ ایک تو مسجد میں دیر ہو جاتی تھی اور مجھے بہت سا ہوم ورک کرنا ہوتا تھا۔ دوسرے محلے کی کچھ لڑکیاں افزا علوی سے قرآن پڑھنے آ جاتی تھیں۔ تو میں بھی ساتھ ہی پڑھ لیتا......

اس رات میں نے کھانا نرس آنٹی کے ساتھ ہی کھایا تھا۔ نرس آنٹی مجھے خدا حافظ کہتے ہوئے بے تحاشا رو رہی تھی۔ یہ میری نرس آنٹی سے آخری ملاقات تھی۔ پھر زندگی میں دوبارہ میں کبھی نرس آنٹی سے نہیں مل سکا۔ حالانکہ جب میں پاکستان آیا تو نرس آنٹی سے ملنے اسی ہاسپٹل میں آیا تھا لیکن پتا چلا کہ وہ اپنی جاب چھوڑ کر گاؤں چلی گئی تھی کیونکہ اس کی ماں معذور ہو کر بستر پڑ گئی تھی اور ماں کو اس کی ضرورت تھی۔ اس کا گاؤں کون سا تھا یہ مجھے معلوم نہ تھا نہ ہی وہاں کسی سے پتا چل سکا۔

♥ ♥ ♥ ♥

میں سرجان کے ساتھ ہالینڈ آ گیا اور اپنی زندگی کے بارہ سال میں نے یوں گزار دیے کہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور پھر پیچھے میرا تھا ہی کون جو مڑ کر دیکھتا۔

میں نے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی تھی اور ایک بڑی کنسٹرکشن کمپنی میں بہترین تنخواہ پر ملازم تھا۔

سرجان مجھ سے محبت کرتے تھے۔

لیزا میری دوست تھی۔

جب پہلی بار میں نے لیزا کو دیکھا تو کتنی ہی دیر تک دیکھتا رہا ......وہ بہت خوبصورت تھی۔ اس کی آنکھیں سبز تھیں اور بال سنہری تھے۔ وہ اپنی سائیکل پر سرجان سے ملنے آئی تھی۔ سرجان بھی ایک طویل عرصہ بعد اپنی بیٹی سے ملے تھے وہ بہت جذباتی سین تھا.... میں منظر سے ہٹ گیا۔ کچھ دیر بعد سرجان کو میرا خیال آیا اور انہوں نے لیزا سے میرا

تعارف کروایا۔

''گلیڈ ٹو میٹ یو۔'' اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

اگلے چند برسوں میں لیزا کے ساتھ میری دوستی بہت گہری ہو گئی تھی میرے مزاج میں ایگریشن' کھردراپن 'وحشت اور غصہ بے حد پیدا ہو گیا تھا۔ شاید یہ ردعمل تھا۔ کبھی کبھی میری اس وحشت اور کھردرے پن کا شکار لیزا بھی ہو جاتی تھی۔ لیکن اس نے کبھی مائنڈ نہیں کیا تھا۔ وہ میری نفسیات سمجھتی تھی ۔وہ ہر ایک ویک اینڈ پر اپنی سائیکل پر ہمارے اپارٹمنٹ میں آ جاتی۔ کچن میں جا کر کافی بناتی۔

سینڈوچز بناتی' کیک بیک کرتی اور بقول سرجان کے اس روز ہماری عید ہو جاتی تھی۔ وہ چکن روسٹ کرتی اور ہم سب مل کر ڈنر کرتے اور پھر اپنی اپنی سائیکلیں اٹھا کر گھومنے نکل جاتے۔ یہاں ہالینڈ میں سائیکلوں کا استعمال بہت زیادہ تھا۔ اگرچہ سرجان کے پاس گاڑی بھی تھی لیکن وہ بھی اکثر سائیکل پر دفتر جاتے تھے۔ ہالینڈ آتے ہی انہوں نے ایک کمپنی میں جاب کر لی تھی۔ وہ اکثر سرجان سے شادی کرنے کو کہتی اور سرجان مسکرا دیتے۔

ایک بار وہ مجھے اپنی ممی سے بھی ملوانے لے گئی...... اس کی ممی ایک شاپنگ پلازہ میں کام کرتی تھی...... وہ واقعی ایک خوبصورت عورت تھی لیزا سے بھی زیادہ......لیزا اپنی ماں کے ساتھ نہیں رہتی تھی بلکہ اپنی ایک فرینڈ کے ساتھ رہتی تھی دونوں نے مل کر ایک اپارٹمنٹ لے رکھا تھا۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں پاکستان آؤں گا۔ میں اپنی زندگی سے مطمئن تھا۔ لیکن پھر مجھے احساس ہوا جیسے سرجان چاہتے ہیں کہ میں لیزا سے شادی کر لوں ......شاید خود لیزا بھی یہی چاہتی تھی۔ ہم دونوں بہت اچھے دوست تھے۔

ان بارہ سالوں میں کئی بار ایسے مقام آئے جب ہم نے ایک دوسرے کے لئے قربانیاں دی۔ ہماری یہ ایک دوسرے کے لئے دی گئی قربانیاں سرجان کے سامنے تھیں۔ ہم

دونوں ایک دوسرے سے بہت مخلص تھے۔ میں اگر لیزا سے کہتا کہ وہ میرے لئے جان دے دے تو وہ دے دیتی۔ اور اگر لیزا مجھے کہتی تو میں اپنا سر خود کاٹ کر اسے پیش کر دیتا...

سر جان ہم دونوں کی دوستی پر خوش تھے وہ شفقت سے مسکراتے ویک اینڈ پر ہمیں گھومنے بھجواتے لمبی چھٹیوں میں کہیں نہ کہیں کا ٹکٹ ہم دونوں کا مل جاتا۔

لیزا میں ایک عادت یہ تھی کہ وہ میرا سارا غصہ اور اگریشن برداشت کر لیتی تھی بلکہ ان لمحوں میں مجھے سہارا دیتی۔ میرے قریب ہونے کی کوشش کرتی مجھ سے اتنی محبت کرتی کہ میں اپنے غصہ پر شرمندہ ہو جاتا......

میں سوچتا ہوں اگر میں لیزا سے شادی کر لیتا تو میری زندگی نارمل ہو سکتی تھی وہ مجھے سنبھال لیتی اور شاید گزرتے وقت کے ساتھ میرے اندر موجود نفرت' غصہ اور کھردرا پن ختم ہو جاتا.... لیکن ایسا نہ ہو سکا میں نے لیزا سے شادی نہیں کی۔ کیونکہ میں نے محسوس کیا تھا کہ سر جان اور لیزا دونوں ہی چاہتے ہیں کہ میں اپنا مذہب تبدیل کر لوں۔ گو انہوں نے زبان سے کبھی نہیں کہا تھا۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہر بات زبان سے کہی جائے۔ کچھ باتوں کے کہنے کے لئے لفظوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ صحیح ہے کہ میں ان کے ساتھ مل کر کرسمس مناتا..... کرسمس ٹری سجانے میں پیش پیش ہوتا..... ایسٹر مناتا..... ولنٹائن ڈے پر خوبصورت پھول اور کارڈ لیزا کو بھجواتا.... لیکن مذہب میرا ذاتی مسئلہ تھا.....

میں مذہب نہیں چھوڑ سکتا تھا..... بھلے میں نے مدتوں سے نماز نہیں پڑھی تھی اور قرآن کو کھول کر نہیں دیکھا تھا.... لیکن میں نے نرس آنٹی سے وعدہ کیا تھا کہ میں مذہب نہیں چھوڑوں گا لیکن اگر میں نرس آنٹی سے وعدہ نہ بھی کرتا تو بھی شاید مذہب نہ چھوڑ سکتا۔

ایک بار لیزا بہت دیر تک مجھ سے اس موضوع پر بات کرتی رہی تھی کہ پاکستانی لڑکے جب یہاں کی لڑکیوں سے شادیاں کرتے ہیں تو انہیں مذہب چھوڑنے پر مجبور کرتے

ہیں' ان کا نام بدل دیتے ہیں حالانکہ وہ خود بھی اپنے مذہب سے پوری طرح آگاہ نہیں ہوتے۔

لیزا بہت اچھی نیچر کی اور محبت کرنے والی لڑکی تھی' اسے ہمارے ہاں کی یہ روایت بہت پسند تھی کہ یہاں اکثر شادیاں والدین کی پسند پر ہوتی ہیں اور طلاقیں بہت کم ہوتی ہیں۔ میں نہ لیزا کو آزمائش میں ڈالنا چاہتا تھا نہ خود کو اور نہ ہی احسان فراموش کہلوانا چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے یکا یک واپس آنے کا فیصلہ کر لیا.....

سر جان اور لیزا میرا فیصلہ سن کر شاک کی سی کیفیت میں مجھے دیکھتے رہ گئے۔ کچھ دیر بعد سر جان نے پوچھا۔ ''بٹ وائے سکندر؟ تم تو یہاں سیٹ ہو۔ بہت اچھی جاب ہے پھر..... وہاں تمہارا کون ہے۔''

''کوئی نہیں۔''

میں نے لیزا کی طرف دیکھا جس نے آج بلیک ٹراؤزر پر ریڈ شرٹ پہن رکھی تھی اور بہت دلکش لگ رہی تھی وہ ابھی تک سکتے کے عالم میں بیٹھی تھی جیسے اسے میری بات کا یقین نہ ہو۔ اس نے اپنی سبز آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔ مجھے لگا جیسے میں ان آنکھوں کے سحر میں جکڑا جاؤں گا۔

بمشکل میں نے اپنی نظریں اس کی آنکھوں کے سحر سے آزاد کیں اور سر جان کی طرف دیکھا۔

''سر! آپ نے ایک بار کہا تھا کہ ایک وقت آتا ہے جب آدمی اپنی اصل کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ اجنبی تہذیب اور ماحول اسے بیزار کر دیتے ہیں۔''

میں نے بارہ سال پہلے سر جان کی کہی ہوئی بات دہرا دی۔ تو سر جان نے پھر اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ البتہ میرے آنے سے ایک دن پہلے کہا۔

"سکندر! جب بھی محسوس کرو کہ تنہا ہو گئے ہو۔ جب کسی اپنے کی ضرورت محسوس ہو تو لوٹ آنا ہم تمہیں منتظر ملیں گے۔"

لیزا اداس تھی۔ اس نے مجھے رکنے کو نہیں کہا تھا لیکن اس کا ہر انداز مجھے روک رہا تھا۔ مگر میں نے اس سے نگاہیں چرالیں اور اسے روتا ہوا چھوڑ کر وطن لوٹ آیا۔ اگرچہ سرجان نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اس سے رابطہ رکھوں لیکن میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ میں چاہتا تھا کہ لیزا مجھ سے مایوس ہو کر شادی کر لے۔

♥ ♥ ♥ ♥

پاکستان میں سوائے نرس آنٹی کے میرا کوئی نہیں تھا۔ سو میں ہوٹل میں سامان رکھ کر سیدھا ہاسپٹل گیا تھا اور ہاسپٹل سے نکل کر بلا ارادہ ہی میرے قدم "علوی ہاؤس" کی طرف چل پڑے تھے۔ پتا نہیں کیوں حالانکہ میں جانا نہیں چاہتا تھا وہاں۔

میں نے کبھی ایک لمحے کو بھی نہیں سوچا تھا کہ میں کبھی دوبارہ ان لوگوں کو دیکھوں گا یا ان سے ملوں گا حالانکہ لیزا مجھ سے اصرار کرتی رہتی تھی کہ میں پاکستان جا کر اپنے حق کا مطالبہ کر دوں.... آخر میں حمید اللہ کا بیٹا ہوں اور جتنا حق نجیب مجیب اور اسمارا کا ہے اتنا ہی میرا بھی ہے۔ لیکن میں ہمیشہ کہتا تھا مجھے سرجان کی محبت اور تمہاری دوستی مل گئی ہے اور اس سے قیمتی اور کچھ بھی نہیں ہے..... لیکن جب میں علوی ہاؤس کے سامنے ٹیکسی سے اترا تو خود ایک لمحہ کو حیران رہ گیا..... پھر میں نے سیاہ گیٹ کے سامنے رک کر کال بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔ حالانکہ ایک لمحہ پہلے میرے دل میں خیال آیا تھا کہ واپس پلٹ جاؤں لیکن جب میں نے کال بیل پر

ہاتھ رکھا تو میرے اندر ایک عجیب کمینی سی خوشی رقص کرنے لگی۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران ہو جائیں گے سب..... شاید ڈر جائیں۔ میں نے دل ہی دل میں اپنے سراپے کے متعلق سوچا.....
میں اب گیارہ سال کا کمزور بچہ نہ تھا' تیس سالہ مرد تھا۔ مضبوط اعضا' کسرتی جسم' جوڈو کراٹے اور یوگا کی مشقوں نے مجھے دشمن سے نبٹنا سکھا دیا تھا.... میرے دل میں شدت سے خواہش پیدا ہوئی کہ آج نجیب اللہ مجھ پر ہاتھ اٹھائے اور میں اس کا وہ ہاتھ اس کے جسم سے علیحدہ کر کے پھینک دوں۔

میں اتنے سالوں سے جو بھولا ہوا تھا۔ وہ سب وہاں گیٹ پر کھڑے کھڑے میں نے یاد کر لیا۔ میرے اندر ایک تیز آگ بھڑک اٹھی.... تب ہی چوکیدار نے گیٹ کی کھڑکی سے جھانکا۔

''کون؟'' یہ چوکیدار نیا تھا.......

''سکندر! اندر جا کر بتاؤ کہ سکندر علوی آیا ہے۔ حمید اللہ علوی کا بیٹا۔''

میں نے مزید وضاحت کی۔

میری وضاحت پر اس نے ایک لمحہ کو ٹھٹھک کر مجھے دیکھا اور پھر کندھے اچکاتا ہوا اندرونی گیٹ تک گیا اور وہاں انٹر کام پر اندر بات کی۔ اور پھر مڑ کر گیٹ کھول دیا۔

''آیئے۔''

سامنے صوفے میں دھنسی وہ رقیہ علوی تھیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ بارہ سالوں میں وہ اتنی بدل جائیں گی۔ وہ بے حد کمزور اور بوڑھی لگ رہی تھیں۔ اور جب انہوں نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور میری طرف اشارہ کیا تو ان کا ہاتھ لرز رہا تھا۔

''تم سکندر ہو..... افزا کے بیٹے۔''

''صرف افزا کا ہی نہیں' حمید اللہ کا بھی بیٹا۔''

میں جب بولا تو مجھے خود یوں محسوس ہوا جیسے میرے لہجے میں سانپ کی سی پھنکار ہو۔

''اپنا حصہ لینے آئے ہو؟'' انہوں نے اپنا ہاتھ نیچے کر لیا۔ ''کل وکیل کو لے آنا اور اپنا حصہ لے لینا۔''

میں ایک لمحہ کو حیران رہ گیا۔

''بیٹھ جاؤ۔''

انہوں نے پھر ہاتھ سے اشارہ کیا۔ میں نے ان کے ہاتھوں میں واضح لرزش محسوس کی۔ شاید انہیں کسی طرح کی بیماری تھی۔

''تمہارا وکیل کاغذات تیار کر لے گا پھر عدالت وغیرہ میں جہاں جو کچھ کرنا ہو' کر لینا۔''

ان کی آواز میں بہت شکستگی سی تھی۔ میں حیران سا بیٹھا تھا۔

''میں عدالت نہیں جا سکوں گی اور........''

انہوں نے پھر کہا تو بے اختیار میرے ہونٹوں سے پھسل پڑا۔

''نجیب اللہ اور مجیب اللہ کہاں ہیں؟''

''نجیب اللہ اس دنیا میں نہیں ہے اب اور.........''

ان کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ ''تمہارے جانے کے کچھ ہی دنوں بعد اسمارہ نے اپنی مرضی سے اپنی ایک سہیلی کے بھائی سے کورٹ میرج کر لی۔

نجیب تو ہمیشہ سے ہی غصے کا تیز ہے۔ پتا نہیں کیوں...... جب حمید اللہ نے شادی کی تھی تب بھی وہ ایسے ہی غصے میں بھر گیا تھا اور بار بار دراز سے ماؤزر نکال لیتا اور کہتا میں ابھی جا کر افزا کو اور ڈیڈی کو شوٹ کر دوں گا۔

وہ تو میں تھی اسے سنبھالے رکھا...... وہ غصے میں چیزیں توڑتا پھوڑتا رہا......''

ان کی آواز بھرا گئی تھی اور آنسو تیزی سے بہنے لگے تھے۔ میں ساکت بیٹھا ان کی بات سن رہا تھا۔ کچھ دیر انہوں نے سنبھلنے میں لگائی اور پھر خود پر قابو پا کر بولیں۔

"امی اپنی ایک سہیلی کے بھائی کو پسند کرتی تھی اور اس سے شادی کرنا چاہتی تھی ان ئوں نے رشتہ بھی بھیجا لیکن نجیب نے انکار کر دیا..... اس کا خیال تھا کہ خاندانی لحاظ سے وہ گ ہمارے ہم پلہ نہیں ہیں۔ تب امی نے کورٹ میرج کر لی اور جانے سے پہلے وہ میرے ام خط لکھ کر چلی گئی۔ میں گھر پر نہ تھی۔ نجیب اللہ نے آفس سے آ کر ٹیبل پر پڑا خط دیکھا اور غصے میں بھر گیا۔ ماؤزر اٹھایا اور یوں ہی الٹے قدموں واپس لوٹ گیا۔ گاڑی میں مجیب بھی تھا۔ دونوں نے کسی فنکشن میں جانا تھا اور وہ مجیب کو گاڑی میں چھوڑ کر اندر دلہن کو بتانے آیا تھا کہ وہ رات ڈنر کر کے آئیں گے۔ لیکن ٹی وی لاؤنج سے واپس پلٹ گیا۔ بھرا ہوا ماؤزر ہمیشہ اس کے پاس ہی رہتا تھا۔ ایک بار ڈاکوؤں نے گاڑی رکوا کر لوٹنے کی کوشش کی تھی تب سے وہ ماؤزر پاس ہی رکھتا تھا..... وہ غصے سے بھرا ہوا باہر نکلا تھا۔ مجیب نے پوچھا تو مختصراً کہا کہ اسمارا اور سہیل کو مارنے جا رہا ہوں..... مجیب کو ابھی تفصیل معلوم بھی نہ ہوئی تھی اور وہ اسے ٹھنڈا ہونے کے لئے کہہ ہی رہا تھا کہ گاڑی سامنے آتے ٹریلر سے ٹکرا گئی۔ وہ غصے میں بہت رف ڈرائیونگ کر رہا تھا اور...... وہ ایسا ہی تھا..... بچپن سے غصیلا اور تنگ مزاج۔ ذرا سی بات مزاج کے خلاف ہوتی تو چیزیں پھینکنے اور توڑنے لگتا۔"

وہ پھر رونے لگیں۔ اب کے ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

میں ابھی تک حیران تھا۔ ہر طرح کے احساس سے عاری۔ خاموشی سے انہیں روتا دیکھ رہا تھا۔

"نجیب تو وہاں ہی دم توڑ گیا تھا' اسٹیرنگ اس کے سینے میں گھس گیا تھا اور مجیب کی ٹانگیں کچلی گئیں۔ گنگرین کا خطرہ تھا' اس لئے کاٹنی پڑیں۔"

کچھ دیر بعد انہوں نے کہا۔

"مجیب اندر ہے اپنے کمرے میں۔ ہر وقت بستر پر لیٹے لیٹے چڑچڑا اور بد مزاج ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر کچھ دیر پہلے ہی نیند کا انجکشن دے کر گیا ہے۔"

تم..... ہمیں معاف کر دو سکندر۔ ہم نے افزا کے اور تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی۔ افزا سے وہ چھینا جو اس کا تھا۔"

ایک بار نرس آنٹی سے افزا علوی نے کہا تھا۔

"میں نے اپنا معاملہ خدا پر چھوڑ دیا ہے اور وہ بہت انصاف کرنے والا ہے۔"

"واقعی خدا سے بڑا منصف کوئی نہیں۔"

میں یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ گھر جائیداد' پلازے' فلیٹ' بزنس سب تمہارا اور مجیب کا ہے۔ بزنس منیجر سنبھالتا ہے۔ مجیب معذور ہے تم سارا بزنس سنبھالو...... میں نے اسمارا کو اس کا حصہ دے دیا تھا...... جب وہ امریکہ جانے سے پہلے مجھ سے ملنے آئی تھی۔ وہ گیارہ سال سے امریکہ میں ہی سیٹل ہے..... میں اپنا حصہ بھی تمہارے نام کرنا چاہتی ہوں.... شاید اس طرح تلافی ہو جائے ان زیادتیوں کی جو ہم نے تم سے روا رکھیں۔"

"کیا اس طرح تلافی ہو سکتی ہے؟"

میں نے اپنے آپ سے سوال کیا اور رقیہ علوی کی طرف دیکھا جو میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

"سکندر! کیا تم نے ہمیں معاف کر دیا؟"

"میں صرف ان زیادتیوں کے لئے آپ کو معاف کر سکتا ہوں مسز حمید اللہ علوی جو آپ نے میرے ساتھ کیں۔ لیکن جو کچھ آپ نے افزا کے ساتھ کیا' اس کے لئے تو وہی معاف کرنے یا نہ کرنے کی مجاز ہے۔ میں نہیں۔"

میں نے دل ہی دل میں سوچا اور رقیہ علوی کی بات کا جواب دیئے بغیر وہاں سے چلا آیا..... یہ شہر میرا تھا۔ لیکن یہاں میرا دم گھٹ رہا تھا۔ عجیب سا بوجھ ذہن و دل پر آ گرا تھا۔

میرا غصہ' میری نفرت میرے اندر ہی منجمد ہو گئی تھی...... میں نے سوچا تھا نجیب

الله اور مجیب الله کو عدالت میں گھسیٹوں گا ..... بھلے سے میرا حق مجھے نہ ملے لیکن میں ان کی جھنجلاہٹ کو انجوائے کروں گا۔

انہیں زچ کر کے لطف اٹھاؤں گا۔لیکن میرا سارا غصہ میرے اندر ہی اندر بل کھا کر رہ گیا تھا۔کھیل ختم ہو گیا تھا۔ مجھے اپنا جینا اپنی زندگی اور وجود بے معنی سا لگنے لگا تھا۔ میں نے ہوٹل سے اپنا سامان سمیٹا اور لاہور ایک دوست کی طرف جانے کے لئے ہوٹل سے نکل پڑا۔اسد ملک مجھے ہالینڈ میں ملا تھا..... وہ یونی سیف کے اسکالر شپ پر وہاں اعلا تعلیم حاصل کرنے آیا تھا۔ہم نے اپنا ایم ایس سی اکٹھا ہی مکمل کیا تھا۔اور پھر ایم فل کی ڈگری بھی اکٹھی ہی لی تھی۔تھیسس کے لئے ہمارا ٹاپک ملتا جلتا تھا۔ میں نے اسلامی آرکیٹیکٹ کو موضوع بنایا تھا جب کہ اس کا موضوع مغل طرز تعمیر تھا۔ میرے غصے اور مزاج کی وحشت کے باوجود وہ مجھے دوست ہی سمجھتا تھا۔اور میرے مزاج کے وحشیانہ پن کو ہنس کر برداشت کر لیتا تھا جب وہ پاکستان واپس آرہا تھا تو اس نے بار بار مجھے تاکید کی تھی کہ میں جب بھی پاکستان آؤں تو اس کے پاس لاہور ضرور آؤں۔

لیزا' سرجان اور نرس آنٹی کے علاوہ اسد ملک کے لئے بھی میرے دل میں ایک نرم گوشہ تھا۔ مجھے دولت اور جائیداد کی ضرورت نہ تھی۔ میرے پاس بہت کچھ تھا.... میں تقریباً چار سالوں سے جاب کر رہا تھا اور میرے اکاؤنٹ میں بہت رقم تھی۔ میرے اخراجات نہ ہونے کے برابر تھے۔سو میں نے یہ شہر چھوڑ دیا.... جہاں میرے بہت سارے حساب کتاب تھے اور لاہور کے لئے روانہ ہو گیا۔

پاکستان آنے سے پہلے میں نے اسد کو ای۔میل کر دیا تھا۔لیکن اپنے آنے کی تاریخ نہیں لکھی تھی۔بس اتنا ہی کہا تھا کہ میں بہت جلد پاکستان آرہا ہوں اور وہاں ہی سیٹل ہونے کا ارادہ رکھتا ہوں۔سو وہ مجھے دیکھ کر حیران بھی ہوا اور خوش بھی۔گویا اس ملک میں نرس آنٹی کے علاوہ اسد ملک بھی تھا۔جو مجھے دیکھ کر خوش ہو سکتا تھا۔خوشگوار سی حیرت کے ساتھ میں

اس کے پاس بیٹھا اس سے باتیں کرتا رہا..... وہ بہت پُر جوش ہو رہا تھا۔اس کے پاس بہت سارے پلان تھے' لیکن مجھے فوری طور پر جو بات مناسب معلوم ہوئی وہ اس کی کمپنی میں جاب تھی۔

''ہماری اس کنسٹرکشن کمپنی میں تمہارے لئے جاب ہے۔ابھی چند دن پہلے ہمارے ایک سینئر انجینئر اینڈرسن جاب چھوڑ کر امریکہ گئے ہیں۔ویکنسی ہے چاہو تو اپلائی کر دو۔''

یہ کنسٹرکشن کمپنی امریکہ کی ہی ایک پارٹی کے تعاون سے سعد خان نے قائم کی تھی اور اس کا کام یو اے ای اور سعودی عربیہ تک میں ہوتا تھا..... یو اے ای اور سعودیہ میں بھی اس کے آفس موجود تھے۔سعد خان نے مجھے فوراً سلیکٹ کر لیا تھا اور دوسرے دن سے ہی کام پر آنے کو کہہ دیا تھا۔

میں چند دن اسد کے ساتھ رہا۔اگر چہ اسد کی بیوی بہت خوش اخلاق تھی۔ بچہ تھا ایک دو سال کا۔اور دونوں نے ہی ضد کی تھی کہ میں ان کے ساتھ ہی رہوں بلکہ اسد کی بیوی نے فوراً ہی خواتین کی فطرت کے مطابق میری شادی کروانے کے پروگرام بھی بنا ڈالے تھے۔ لیکن میں نے اس طرح ساتھ رہنا مناسب نہیں سمجھا تھا اور جلد ہی شادمان میں ایک فلیٹ کرائے پر لے کر وہاں منتقل ہو گیا تھا۔

♥ ♥ ♥ ♥

زندگی کی ایک نئی روٹین شروع ہو گئی تھی۔ میں نے نجیب اللہ، حمید اللہ، رقیہ علوی سب کے متعلق سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ میں افزا علوی اور حمید اللہ علوی کو بھی نہیں سوچتا تھا..... میرے دل میں ان کے لئے کوئی جذبہ بیدار نہ ہوتا تھا، لیکن مانی اب بھی میرے تصور میں چلا آتا تھا..... کبھی کاٹ میں پڑے انگوٹھا چوستے ہوئے اور کبھی وکٹ میں چھائے ہوئے بیٹنگ کرتے یا باؤلنگ کرتے۔ افزا علوی اور حمید اللہ کے لئے میری محبت ختم ہو گئی تھی۔ بہت ساری نفرتوں اور غصے کے انبار تلے دب گئی تھی۔ لیکن مانی کے لئے میری محبت اسی طرح تروتازہ تھی۔ میں ہر رات سونے سے پہلے اسے ضرور یاد کرتا تھا۔ اور پھر اس کی موت اور نجیب اللہ علوی اس کا قاتل۔ غصہ میری رگوں میں بل کھاتا اور میں دل ہی دل میں سوچتا تھا کہ زندگی نے اگر موقع دیا تو میں بھی نجیب اللہ علوی کے ساتھ ایسا ہی کروں گا ......

لیکن اب تو کھیل ختم ہو چکا تھا۔ زندگی بہت ڈل ہو گئی تھی۔ لیکن کبھی کبھی اس خیال

سے مجھے تقویت ہوتی کہ میں نے اگرچہ دل سے رقیہ علوی کو معاف کر دیا تھا لیکن زبان سے نہیں ...... اور یہ احساس کہ میں نے انہیں معاف نہیں کیا تھا..... انہیں اذیت دیتا ہو گا..... وہ اور مجیب اللہ حیران تو ہوتے ہوں گے کہ میں اتنی بڑی جائیداد کو چھوڑ کر چلا گیا ہوں۔ شاید وہ سوچتے ہوں کہ میں کسی دن پلٹ آؤں گا۔ اور یہ انتظار انہیں جھنجلاتا ہو۔ تکلیف دیتا ہو۔ اس احساس سے میں خود کو خوش کرنے کی کوشش کرتا لیکن یہ خوشی وقتی ہوتی۔

تھوڑی دیر بعد ہی یہ خوشی ختم ہو جاتی اور میں اندر ہی اندر بجھتا چلا جاتا۔ میرے سامنے۔ کوئی ٹارگٹ نہ تھا میں اپنا غصہ اپنے ماتحتوں پر نکالتا..... چھوٹی سی بات پر ان کی تذلیل کر کے خوش ہوتا۔ اور جب وہ بے بس ہو کر سر جھکا لیتے تو مجھے بڑی کمینی سی خوشی ہوتی میں بالکل غیر محسوس طریقے پر اپنا غصہ اور ایگریشن اس طرح کم کرنے لگا۔ حالانکہ ہالینڈ میں ایسا نہ تھا...... کبھی کبھار ایسا ہوتا تھا کہ میں غصیلا ہو جاتا، لیکن لیزا اگر ہوتی تو مجھے فوراً ہینڈل کر لیتی تھی...... مگر اب تو میں ہر وقت ہی غصے میں بھرا رہتا لیکن چونکہ میرا کام بہت اچھا تھا میں بہت دل لگا کر اور لگن سے کام کرتا تھا اس لئے میرا باس مجھ سے بہت خوش تھا اور میری چھوٹی موٹی کوتاہیوں کو نظر انداز کرتا تھا، میں نے دو تین پراجیکٹ بڑی کامیابی سے اور بہت کم عرصے میں مکمل کروائے تھے، اس لئے سعد خان دل سے میری قدر کرتا تھا۔

کبھی کبھار لیزا کا فون آ جاتا تھا..... وہ مجھے ڈانٹتی بھی۔ واپس آنے کو بھی کہتی اور پھر جیسی تمہاری خوشی کہہ کر خدا حافظ کہہ دیتی۔ پتا نہیں میں لیزا سے محبت کرتا تھا یا نہیں میں نے اس پر کبھی غور نہیں کیا اور نہ ہی سوچا تھا۔

لیکن میں نے اوج کمال کے متعلق بارہا سوچا اور مجھے لگا میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں..... ہمیں ایک نیا پراجیکٹ ملا تھا..... ایک بڑے ہاسپٹل کی تعمیر کا...... اور اس پراجیکٹ میں اوج کمال مجھے اسسٹ کر رہی تھی..... اوج کمال اس کمپنی کی ملازم تھی اور اس سے پہلے کراچی آفس میں تھی۔ مجھے سب سے پہلے جس چیز نے متاثر کیا۔ وہ اس کی ذہانت

تھی۔ سعد خان نے اس کا تعارف مجھ سے کرواتے ہوئے کہا تھا۔

''اوج کمال ہماری کمپنی کی ایک ذہین کارکن ہیں۔ آپ کو اس کے ساتھ کام کر کے مزا آئے گا۔''

اور چند ہی دنوں میں مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ سعد خان نے بالکل صحیح کہا تھا۔

وہ بلا کی خود اعتماد تھی۔

بلا کی ذہین۔ اس کے اندر فوری فیصلہ کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ میری عدم موجودگی میں کئی بار اس نے اپنے طور پر کوئی فیصلہ کیا تو اس سے بہت فائدہ ہوا اور ہم کسی بڑے نقصان سے بچ گئے۔ میں نے دل ہی دل میں اس کی قوت فیصلہ کو از حد سراہا لیکن بظاہر اسے بہت ڈانٹا ڈپٹا..... پتا نہیں کیوں مجھے اس کی خود اعتمادی' اپنی ذات پر بھروسا اندر سے غصیلا کر دیتا تھا..... سینکڑوں بار میں نے لیبر کے سامنے اس کی انسلٹ کر دی۔ بلاوجہ ڈانٹا لیکن جواب میں وہ صرف ایک ترحم بھری نظر مجھ پر ڈال کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتی۔ میں اور جھنجلاتا اندر ہی اندر غصہ سے بل کھا کر رہ جاتا..... شاید میں ایک نفسیاتی مریض بنتا جا رہا تھا۔

میں اب صرف اوج کمال کو ہی نہیں سب کو ہی اپنے سامنے بے بس دیکھ کر طمانیت اور خوشی محسوس کرتا تھا۔ جب میرے ماتحت بے بسی سے مجھے دیکھتے تو میں ان پر ایک حقارت بھری نظر ڈال کر اپنے اندر میں بہت پُرسکون ہو جاتا..... صرف اوج کمال تھی جو میرے کسی بھی رویے پر بے بس نہ دکھتی' بلکہ وہ مجھے رحم اور ترس بھری نظروں سے دیکھتی میں اندر ہی اندر جھلس کر رہ جاتا۔ گرم خون میری کنپٹیوں پر ٹھوکریں مارتا اور وہ ٹھک ٹھک کرتی نخوت سے سر اٹھائے چلی جاتی۔

میرے اندر جیسے نجیب اللہ کی روح سما گئی تھی..... اس روز میں نے ایک ذرا سی غلطی پر ایک مزدور کو تھپڑ مار دیا۔ اس نے میرے حکم کے باوجود سیمنٹ کی مقدار کم ڈالی تھی۔ وہ

تھپڑ کھا کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے بسی تھی۔ اندر ہی اندر بل کھاتا غصہ تھا جو بے بسی میں ڈھل گیا تھا وہ جواباً مجھے تھپڑ نہیں مار سکتا تھا ایک لمحہ کو مجھے یوں لگا تھا جیسے وہ مزدور میں ہوں اور میری جگہ نجیب اللہ کھڑا ہے۔ اور میں جواباً نجیب اللہ کو تھپڑ نہیں مار سکتا اور بے بسی سے ہونٹ کاٹ رہا ہوں۔

''سکندر! تمہیں کیا پرابلم ہے؟'' میرے بالکل سامنے کھڑی اوج کمال مجھ سے پوچھ رہی تھی۔ ''کبھی کبھی تم نفسیاتی مریض لگنے لگتے ہو۔''

''شٹ اپ'' میں نے غصے سے اسے دیکھا اور اسے وہیں سائیٹ پر چھوڑ کر واپس آفس آ گیا۔ حالانکہ وہ میرے ساتھ سائیٹ پر گئی تھی یہ جگہ جہاں ہاسپٹل بن رہا تھا شہر سے کافی دور مضافات میں تھی اور میں جانتا تھا کہ اس کے لئے کنوینس کا پرابلم ہو جائے گا..... پھر بھی میں غصے میں اسے چھوڑ آیا تھا۔ کچھ دیر بعد جب میرا غصہ کم ہوا تو میں دوبارہ اسے لینے چلا گیا۔ وہ وہاں سائیٹ پر موجود مزدوروں کے ساتھ بیٹھی مزے سے چائے پی رہی تھی۔

''تف ہے مجھ پر' میں اسے یہاں اکیلا چھوڑ گیا تھا۔'' میں نے خود کو ڈانٹا۔

''سکندر! تم آخر اس قدر غصے میں کیوں رہتے ہو۔''

اس کا لہجہ بہت نرم اور میٹھا تھا' بالکل لیزا کی طرح' میں نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہوئی اوج کمال کو ذرا سا رخ موڑ کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک نرم سا تاثر تھا۔ اس کی آنکھیں بہت دلکش تھیں۔ میں نے پہلی بار ان آنکھوں کو غور سے دیکھا یکدم سیاہ' اتنی گھور سیاہ آنکھیں اور ان میں بے تحاشا چمک اس کی رنگت صاف تھی اور میرے مسلسل دیکھنے سے چہرے پر گلابی پن جھلک آیا تھا۔ اس کے ہونٹ بے حد دلکش تھے۔ لپ اسٹک سے بے نیاز ان ہونٹوں پر ہلکی سی نمی تھی۔

دوسرے مسلسل دیکھنے سے وہ اور گلابی ہوئی اور بے اختیار اس کی پلکیں جھک گئیں۔ صبیح رخساروں پر ان کا سایہ بہت دلفریب لگ رہا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک حسین اور خوبصورت لڑکی

تھی۔ دل کی دھڑکن کو یکدم ابنارمل کر دینے والی۔

''تمہارے ساتھ یقیناً ماضی میں کچھ اچھا نہیں ہوا لیکن سکندر! اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا بدلہ ہم دوسروں سے تو نہیں لے سکتے نا۔''

ابھی کچھ دیر پہلے کا دلفریب احساس جس نے دل کو گرفت میں لے رکھا تھا یکدم ذہن سے محو ہو گیا اور اندر وہی گرم ہوائیں چلنے لگیں۔ میں نے ہونٹ بھینچ لیے اور سخت لہجے میں اسے تنبیہہ کی۔

''مس اوج کمال! میں ذاتیات پر گفتگو پسند نہیں کرتا۔ آئندہ اس سے گریز کیجئے گا۔ میں جو یہاں دوبارہ آپ کو لینے آیا ہوں تو محض اپنا فرض اور ڈیوٹی جان کر..... آپ کے حسن سے متاثر ہو کر نہیں۔''

ایک لمحہ کو میری نگاہوں نے اس کی نظروں کو چھوا جہاں ایک لمحہ حیرت ابھر کر معدوم ہو گئی تھی اور رخساروں کی گلابیاں زرد پڑ گئی تھیں۔ میں نے اپنے اندر وہی کمینی سی خوشی پھیلتے دیکھی۔

میں نے اوج کمال سے تو کہہ دیا تھا کہ میں اس کے حسن سے متاثر نہیں ہوں' لیکن جب اسد اور اس کی بیوی میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے کہ مجھے اب شادی کر لینی چاہئے تو میری آنکھوں کے سامنے بار بار اوج کمال آنے لگی۔

''یار! تمہیں اس اکیلے گھر میں وحشت نہیں ہوتی۔''

اسد نے کہا تو میرے بجائے اس کی بیوی نے جواب دیا۔

''وحشت کیوں نہیں ہوتی ہو گی...... میں نے تو سوچ لیا ہے' میں اب سکندر بھائی کی کوئی بات نہیں سنوں گی...... حد ہو گئی ہے۔ اپنا کچھ خیال ہی نہیں...... سنیں سکندر بھائی! کل شام کو آپ ہماری طرف آیئے گا...... میں ایک لڑکی سے آپ کو ملواؤں گی۔ ہمارے پڑوس میں رہتی ہے۔ بہت کیوٹ سی ہے۔ آپ کو پسند آئے گی۔''

''تم بھی کمال کرتی ہو یار! لڑکی بھی پسند کرنے لگیں۔ پہلے سکندر سے تو پوچھ لو کہ اسے کوئی پسند تو نہیں ہے۔ کیا خبر حضرت کہیں دل وِل لگا بیٹھے ہوں۔'' اسد نے بیوی کو ٹوکا۔

''اگر ایسی کوئی بات ہے بھائی! تو بتا دیجئے' ہم آج ہی جھولی پھیلانے چلے جاتے ہیں۔ بھلا کون انکار کرے گا۔ اتنا خوبصورت۔''

اسد ہولے سے کھانسا ''بیوی ہمارے سامنے ہی غیر کی تعریف......''

''فضول باتیں نہیں۔'' اس نے ٹوک دیا۔ ''ہاں بتایئے نا سکندر بھائی۔ اگر کوئی ہے تو نہیں تو میری پسند کی ہوئی لڑکی سے شادی کرنا پڑے گی بس......''

''اوج..... اوج کمال۔'' بے اختیار میرے لبوں سے پھسل پڑا۔

''ارے گھنے.....'' اسد نے میرے پیٹھ پر دھموکا مارا۔ ''یعنی معاملہ یہاں تک پہنچ گیا اور ہمیں خبر تک نہ ہوئی وہاں تو آفس میں اور سائیٹ پر بے چاری کا خون خشک کیے رکھتے ہو۔ لگتا ہے یا اس دنیا میں تم سے بڑا دشمن اس کا کوئی اور نہیں ہے۔''

''نہیں یار!'' میں جھینپ گیا ''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کی منگنی ہو چکی ہے یا نہیں...... وہ کہیں انٹرسٹڈ ہے۔ اس کا فیملی بیک گراؤنڈ کیا ہے۔ اور آج سے پہلے میں نے کبھی اس کے لئے اس طرح نہیں سوچا لیکن ابھی جب بھابھی نے کہا تو میرے ذہن میں اس کا خیال آ گیا خود بخود ہی کہ بجائے ادھر ادھر دیکھنے کے......''

''ہاں یار! تمہارے ذہن میں بالکل صحیح خیال آیا ہے۔ وہ ایک بہترین لڑکی ہے ہر لحاظ سے۔ خوبصورت' خوب سیرت اور مضبوط کردار کی...... تمہارے لئے ایک ایسی لڑکی ہونا چاہئے تھی۔''

اسد نے تبصرہ کیا۔

میری زبان سے اوج کا نام پھسل تو گیا تھا لیکن اب میں متذبذب سا تھا۔

''پتا نہیں اوج مجھے پسند بھی کرتی ہے یا نہیں۔''

''تمہارا جو سلوک اس کے ساتھ رہا ہے اس حساب سے تو اس کو تمہیں ناپسند ہی کرنا چاہئے لیکن ان لڑکیوں کی قوم کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ سو ٹرائی کر لیتے ہیں۔'' اسد کچھ شوخ ہو رہا تھا۔

دونوں خوش تھے۔ پلان بنا رہے تھے۔ اسد کی بیوی نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ اب یہ ان کا مسئلہ ہے اور انشا اللہ بہت جلد اوج کمال اگر وہ پہلے سے منگنی شدہ نہیں ہے تو دلہن بن کر میرے سنگ ہو گی۔ لیکن میری کیفیات کیا تھیں۔ مجھے اس کی خبر نہ تھی۔

میں نے اپنے اندر جھانکا تو وہاں سناٹا تھا۔ گہرا اور لحہ بہ لحہ بڑھتا ہوا سناٹا۔

شادی میرے پلان میں کہیں نہیں تھی۔ میں جب ہالینڈ سے چلا تھا تو میرے ذہن میں صرف یہ تھا کہ میرے جانے کے بعد مایوس ہو کر لیزا شادی کر لے۔ دوسرے مجھے یہ خوف تھا کہ کہیں سرجان نے اگر کسی روز خود اپنی زبان سے مجھ سے کہہ دیا کہ لیزا سے شادی کر لو تو میں انکار نہ کر سکوں گا........

لیزا نے کہا' اپنا مذہب چھوڑ دو تو کوئی راستہ نجات کا نہیں ہو گا' سب دروازے بند ہو جائیں گے تب میرے لئے کوئی جائے فرار نہیں ہو گی۔

یا پھر شاید میں یہاں آ کر نجیب اللہ کو تنگ کرنا چاہتا تھا' میں نے جہاز میں کتنے ہی پلان بنائے تھے کہ ملک کے سب سے بڑے وکیل کو ہائر کروں گا اور جانے کیا کیا...... لیکن سب کچھ بے فائدہ تھا...... اور اب میں نہ صرف شادی کے لئے رضامند ہو گیا تھا بلکہ اس کے لئے اوج کمال کا نام بھی تجویز کر دیا تھا۔

کیا میں اوج کمال سے محبت کرتا تھا۔؟

کیا مجھے بھی خالی گھر سے وحشت ہونے لگی تھی؟۔ اگر میں اوج کمال سے محبت نہیں کرتا تھا تو کیا اس سے متاثر تھا؟۔ اس وقت میرے پاس کسی سوال کا جواب نہ تھا۔

♥ ♥ ♥ ♥

اسد کی بیوی نے جو کچھ کہا تھا کر دکھایا اور چند ہی دنوں بعد میں اسد کے ساتھ اوج کے ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔ اوج کے ڈیڈی نے مجھے شام کی چائے پر بلایا تھا۔

''نائنٹی نائن پرسنٹ امید ہے۔'' اسد کی بیوی نے کہا۔ ''یہ تو محض رسمی بات ہے ظاہر ہے' لڑکی کے والدین کا حق ہے کہ کوئی بھی مثبت جواب دینے سے پہلے لڑکے سے مل کر اور اسے دیکھ کر تسلی کر لیں۔''

اس نے مزید وضاحت کی۔

''یوں بھی میں نے سکندر بھائی کی بے حد تعریف کی ہے اور ساتھ ہی کہہ دیا ہے کہ اوج سے بھی وہ اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ وہ اس کی کولیگ ہے۔''

اوج کے والد کمال صاحب ایک شاندار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے لئے گریس فل کہنا مناسب ہو گا' نرم اور شفیق لہجے میں بات کرتے تھے اور آدمی چند لمحوں بعد ہی ان

کی شخصیت کے سحر میں گرفتار ہو جاتا تھا۔ وہ مجھ سے کافی دیر تک میری تعلیم اور میری جاب کے متعلق پوچھتے رہے' میں نے ان کی آنکھوں میں اپنے لئے ایک واضح تحسین محسوس کی۔

گفتگو کا رخ تعلیم سے ہٹ کر فیملی کی طرف مڑا تو میں نے بتایا کہ میرا کوئی قریبی عزیز نہیں ہے۔ سوتیلی والدہ اور بھائی ہے لیکن میرا ان سے کوئی تعلق وغیرہ نہیں ہے۔ لہٰذا اسد اور بھابھی کو ہی سب کچھ کرنا ہے۔

''پھر بھی ننھیال ددھیال میں کوئی تو ہوگا۔'' انہوں نے پوچھا۔

''بدقسمتی سے میری والدہ کے والدین ان کے بچپن میں ہی وفات پا گئے تھے اور ان کی پرورش ان کے دور کے عزیزوں نے کی تھی یہی وجہ تھی کہ انہوں نے میری والدہ کی شادی ایک ایسے شخص سے کر دی جو پہلے سے شادی شدہ اور تین بچوں کا باپ تھا۔''

میرے لہجے میں غیر اختیاری طور پر تلخی آ گئی تھی۔

''میرے والد حمید اللہ علوی کا انتقال میرے بچپن میں ہو گیا تھا۔ گیارہ سال کی عمر میں میری والدہ بھی وفات پا گئیں۔''

میں نے تفصیل بتائی اور میں نے محسوس کیا کہ حمید اللہ علوی کا نام سن کر وہ ذرا سا چونکے تھے۔

''آپ کی والدہ کا نام؟'' انہوں نے پوچھا۔

''افزا علوی۔''

میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ مضطرب سے ہو گئے ہیں۔ اضطراب اور بے چینی ان کی آنکھوں سے جھلک رہی تھی۔ پھر وہ کچھ دیر تک مزید سوالات کرتے رہے۔ جن میں زیادہ تر سوال میری ایجوکیشن کے متعلق ہی تھے کہ میں نے کہاں اور کیسے رہ کر تعلیم حاصل کی۔ میں نے زیادہ تفصیل سے گریز کرتے ہوئے مختصراً بتایا کہ میری ایجوکیشن کی ذمہ داری میرے ایک محترم استاد نے سنبھال لی تھی۔

چائے کے دوران انہوں نے ریلیکس موڈ میں بتایا کہ وہ بھی ایک طویل عرصے تک اسی محلے اور اسی شہر میں رہے ہیں۔ گو حمید اللہ علوی کو انہوں نے دیکھا نہیں تھا لیکن نام سے جانتے ہیں۔

چائے بہت خوشگوار ماحول میں ختم ہوئی اوج کی ممی بھی ایک نفیس خاتون تھیں۔

''اوج ہماری اکلوتی بیٹی ہے۔ ایک بیٹا بھی ہے۔ جو میرے بھائی کا بیٹا ہے۔ لیکن اوج کی تنہائی کے خیال سے میں نے اسے بچپن میں ہی گود لے لیا تھا۔ آج کل وہ آسٹریلیا گیا ہوا ہے۔ اوج سے ایک سال چھوٹا ہے۔''

انہوں نے بتایا اور بہت دیر تک اوج اور بلال کے بچپن کی باتیں کرتی رہیں۔ کچھ دیر بعد ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ کمال اور بیگم کمال نے بہت گرم جوشی سے ہمیں رخصت کیا۔

''حالات بہت امّید افزا ہیں۔'' واپسی پر اسد نے تبصرہ کیا۔

لیکن میں خاموش ہی رہا۔ پتا نہیں کیوں مجھے کمال صاحب کچھ مضطرب اور بے چین لگ رہے تھے۔ شاید ایک تنہا اکیلے لڑکے پر بھروسا کرتے ہوئے متذبذب تھے۔ میرا خیال تھا کہ شاید کمال صاحب معذرت کر لیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا اور اسد کا خیال صحیح نکلا' چند دن بعد اسد اور اس کی بیوی مٹھائی کے ڈبے اٹھائے اور مبارک مبارک کا شور کرتے ہوئے میرے فلیٹ میں داخل ہوئے۔ میں اس وقت سو رہا تھا' شام چھ بجے ہی سائیٹ سے آیا تھا اور اب تھک کر سو رہا تھا۔

''کیا صبح تک صبر نہیں کر سکتے تھے تم؟'' میں نے اسد کو جھاڑا۔

''ابھی صرف نو بجے ہیں بھائی! آٹھ بجے میں نے اوج کے گھر فون کیا تھا۔'' اسد کی بیوی منمنائی۔ ''اور ہم سے صبر نہیں ہو سکا۔ جوں ہی کمال صاحب نے بتایا کہ انہیں آپ کا پروپوزل قبول ہے تو ہم.....''

''خوشی سے ناچنے لگے۔'' اسد نے اس کی بات کاٹ دی۔

میں برا سامنہ بنا کر آنکھیں ملتا ہوا بیٹھ گیا۔

''تم انتہائی ناشکرے آدمی ہو' میں تمہاری جگہ ہوتا تو خوشی سے بھنگڑا ڈالتا۔''

''اب برائے مہربانی میری جگہ تم ہی بھنگڑا ڈال لو۔''

میں نے بمشکل اپنا موڈ بحال کیا۔ واش روم میں جا کر پانی کے چھینٹے مارے' آنکھیں تب کہیں جا کر کھلیں۔

''بلاشبہ اوج ایک انتہائی خوبصورت اور ذہین لڑکی ہے' آپ بہت خوش قسمت ہیں سکندر بھائی! یقیناً چاند سورج کی جوڑی ہے۔''

اسد کی بیوی بھی بے حد خوش تھی۔ وہ دونوں بہت دیر تک شادی کے پلان بناتے رہے اور اسد نے تو باقاعدہ بھنگڑا ڈالا اور بے سری آواز میں گاتا رہا۔ میں نے کوشش کی تھی کہ میں ان کی خوشی کو تھوڑا بہت شیئر کروں تاکہ انہیں اپنے خلوص کے رائیگاں جانے کا احساس نہ ہو۔ مگر شاید اس میں ناکام رہا تھا تب ہی ٹیبل پر طبلہ بجاتے بجاتے اسد سے پوچھ لیا۔

''سکندر! تم خوش نہیں ہو کیا؟''

''نہیں ٹھیک ہے سب..... دراصل مجھے خوشی کا اظہار کرنا نہیں آتا۔ میں عادی نہیں ہوں نا۔''

میں نے آہستگی سے کہا اور اسد مطمئن سا ہو گیا۔

''اوج بھابھی آ کر خود ہی سارے احساسات جگا دیں گی۔''

وہ ہنسا اور بھابی نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

وہ تقریباً بارہ بجے تک یونہی ہنگامہ کرتے رہے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے اپنا تجزیہ کیا۔ میرے اندر وہی دور تک پھیلتے سناٹے تھے۔

چند دنوں بعد ہی ایک چھوٹی سی تقریب میں منگنی کی رسم ادا کی گئی اور ساتھ ہی شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ میں نے لیزا کو بتایا تو وہ ازحد حیران ہوئی اور بار بار اس نے مجھ سے

پوچھا۔

''تم خوش ہو سکندر؟ کیا تمہیں یقین ہے کہ تم اوج کے ساتھ خوش رہو گے۔؟ میرا دل کہتا ہے تم خوش نہیں رہ سکو گے۔''

میں نے اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی محسوس کی لیکن نظر انداز کر دیا۔

سرجان نے مجھے بہت خلوص سے مبارکباد دی اور میں دل ہی دل میں نادم سا ہو گیا۔ میں سرجان کی خواہش اور لیزا کے جذبوں سے ناآشنا تو نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے اپنا اندر ٹٹولنے کی کوشش کی۔

کیا میں لیزا سے محبت کرتا ہوں۔

لیکن اندر دور تک خاموشی تھی۔

شاید نہیں' وہ صرف میری دوست ہے۔

میں نے خود سے کہا۔ اوج بدستور میرے ساتھ کام کر رہی تھی۔ آفس میں اور سائیٹ پر میرا رویہ اس کے ساتھ بالکل نارمل تھا' اس نے بھی کچھ ظاہر نہیں کیا تھا کہ میرے اور اس کے درمیان کوئی رشتہ قائم ہو چکا ہے۔ شادی سے پندرہ دن پہلے اس نے چھٹی لے لی تھی۔

میری طرف سے سب تیاری اسد اور اس کی بیوی نے کی تھی۔ سرجان اور لیزا میری شادی میں شرکت کے لئے نہ آ سکے تھے' البتہ سرجان نے ایک بڑی رقم کا چیک شادی کا گفٹ بھیجا تھا اور لیزا نے دل کی شکل کا لاکٹ جس کے مرکز میں ڈائمنڈ لگے تھے۔ میرے لئے اس دنیا میں سب سے زیادہ اپنے سرجان اور لیزا ہی تھے۔ وہ اس شادی میں شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ سو مجھے کسی اور کو انوائیٹ نہیں کرنا تھا۔ اسد اور بھابھی نے ہی اپنے جاننے والوں کو بلا رکھا تھا۔

اوج میری دلہن بن کر میرے فلیٹ میں آ گئی۔ اس روز اس نے میرون اور آف

وائٹ ڈریس پہن رکھا تھا' اور بے انتہا دلکش لگ رہی تھی۔ ایک لمحہ کو تو میں مبہوت سا رہ گیا۔

میں نے لیزا کا بھیجا ہوا لاکٹ ہی اسے رونمائی میں دیا تھا' دراصل مجھے اس کا خیال ہی نہیں آیا تھا کہ مجھے خود بھی کچھ خریدنا ہے۔ یہ تو رخصتی کے کچھ دیر بعد اسد کی بیوی نے پوچھا کہ ''بھائی !اوج کی رونمائی کے لئے کیا خریدا ہے۔''

تو تب مجھے پتا چلا تھا کہ مجھے بھی خود کچھ خریدنا ہے۔ لیزا کا بھیجا ہوا لاکٹ میرے پاس ہی پڑا تھا جو ایک دن پہلے ہی مجھے ملا تھا۔ سو میں نے وہی اسد کی بیوی کو دکھا دیا۔

♥ ♥ ♥ ♥

زندگی کی ایک نئی روٹین شروع ہو گئی تھی۔ میں نہیں جانتا کہ اوج اس شادی سے خوش تھی یا نہیں لیکن خود اپنے احساسات کا مجھے پتا نہیں چل رہا تھا' شادی بھی میرے لئے زندگی کے دوسرے کاموں کی طرح ایک کام تھی جسے میں نے مشینی انداز میں کر لیا تھا۔

چند ہی دنوں میں اوج نے گھر کا سارا انتظام سنبھال لیا تھا' وہ صبح سویرے اٹھ کر ناشتہ بناتی۔ میرے کپڑے استری کر کے مجھے تیار ہونے میں مدد دیتی' غرض اچھی بیویوں والے سارے کام وہ خاموشی سے کر رہی تھی۔ ہم لوگ ہنی مون کے لئے باہر نہیں جا سکے تھے۔ اس وقت جب پراجیکٹ اپنے آخری مراحل میں تھا میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔

پراجیکٹ کی تکمیل کے بعد ریلیکس ہو کر چلے جائیں گے۔'' اوج نے بھی میری تائید کی تھی۔

یوں' ہمارا ہنی مون پینڈنگ میں پڑ گیا تھا۔ اوج کی چھٹی ختم ہوئی تو اس نے مجھ

سے پوچھا کہ کیا وہ اپنی جاب جاری رکھ سکتی ہے۔

وہ ایک ٹیلنٹڈ لڑکی تھی۔ بعض اوقات اس کے مشورے بڑے کارآمد ہوتے تھے۔ سو میں نے اسے جاب جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔

''تھینک یو سکندر!'' میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں یکدم لو دے اٹھی تھیں۔ اور چہرا کھل اٹھا تھا۔

اس کی خوشی دیکھ کر پتا نہیں کیوں میرے اندر یہ کمینہ خیال پیدا ہوا کہ میں اسے جاب پر جانے سے منع کر دوں اور پھر اس کی بے بسی دیکھوں۔ ظاہر ہے وہ میرے منع کرنے کے باوجود جاب پر کیسے جا سکتی تھی۔ اس کی بے بسی اور جھنجلاہٹ کے تصور سے ہی میرے اندر خوشی کے پھول سے چٹکے۔ لیکن وہ مجھے اسسٹ کر رہی تھی۔ اور سب کام کو بہتر سمجھتی تھی۔

میں پراجیکٹ کے اس اختتامی مرحلے پر کسی اور کو افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ سو میں نے اپنی خواہش پر قابو پا لیا لیکن بہت دیر تک دل ہی دل میں اپنی اس خواہش پر حیران ہوتا رہا۔

اور اوج گنگناتی ہوئی چائے بناتی رہی۔ وہ بہت خوش تھی اور مجھے اس کی خوشی بالکل بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

پتا نہیں کیوں' ہماری شادی کو پندرہ دن ہو گئے تھے اور آج پہلی بار میں نے اسے اتنا خوش دیکھا تھا۔

''سکندر آپ نے مجھ سے شادی کیوں کی' حالانکہ آفس میں اور سائٹ پر آپ کا رویہ میرے ساتھ بہت سخت تھا؟'' اس نے چائے کا کپ میرے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا۔

لیکن اس کا سوال کا جواب تو میرے پاس بھی نہیں تھا کہ میں نے اس سے شادی کیوں کی۔ یہ تو مجھے اب آن کر پتا چلا ہے کہ میں نے اس سے شادی کیوں کی تھی۔ لیکن تب میں اپنے لاشعور کی کارستانی سے بے خبر تھا۔

''شاید اس لئے کہ میں تمہارے علاوہ کسی لڑکی کو نہیں جانتا تھا اس لئے میں نے

بھابھی کے سامنے تمہارا نام لے دیا۔''

میں نے محسوس کیا کہ میرے جواب نے اسے کچھ مایوس کیا ہے۔ شاید وہ یہ سننا چاہتی تھی کہ میں اس سے محبت کرنے لگا تھا اس لئے وہ اس قابل تھی کہ اس سے محبت ہو جائے لیکن مجھے شاید اس سے محبت نہ تھی تب اور نہ ہی میں نے اس لئے اس سے شادی کی تھی کہ مجھے اس سے محبت ہے۔

محبت تو میں نے اس سے اب کی تھی۔ اس کے جانے کے بعد اور یہ تو مجھے اب پتا چلا تھا کہ میں سکندر علوی اوج کمال سے کتنی شدید محبت کرتا ہوں۔

اتنی شدید کہ مجھے لگتا ہے کہ میں اب اس کے بغیر جی نہ پاؤں گا۔

میں نے اپنا تجزیہ کیا ہے جب سے وہ گئی ہے تب سے میں ہر رات اپنا احتساب کرتا ہوں۔

مجھے اس کی خود اعتمادی اچھی نہیں لگتی تھی۔

میں اسے جھکانا چاہتا تھا۔ بے بس دیکھنا چاہتا تھا۔

مجھے اس سے کوئی دشمنی نہ تھی۔ اس نے میرا کچھ نہیں بگاڑا تھا' بلکہ میرے گھر کو اور مجھے سنوارنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اس کی زندگی عذاب بنا دی تھی۔

وہ ساری نفرت' وہ سارا غصہ جو میرے اندر تھا۔ وہ میں نے اس پر انڈیل دیا۔

میں نجیب اللہ علوی' رقیہ علوی۔ اسمارا علوی اور مجیب اللہ علوی سے اپنا بدلہ نہیں لے سکا تھا' قدرت نے انصاف اپنے ہاتھ میں رکھا تھا۔ سو وہ سارا غصہ' ساری نفرت میرے اندر ہی اندر بل کھاتی رہتی تھی۔ اور اس غصے کی آگ میرے وجود کو جلاتی رہتی تھی۔

میں غیر ارادی طور پر اوج پر اپنا غصہ اتارنے لگا۔ میں چاہتا تھا وہ روئے چیخے چلائے اور میرے رویوں اور سلوک پر احتجاج کرے لیکن اس نے کبھی احتجاج نہیں کیا تھا۔ بس کبھی کبھار شکوہ بھری نظروں سے مجھے دیکھتی۔

میں اس کے احتجاج نہ کرنے پر اور بھی جھنجلاتا۔ میرا غصہ اور بھی سوا ہو جاتا اور میں اسے مزید اذیت دیتا۔ کئی دفعہ مجھے اپنے رویے پر افسوس بھی ہوتا اور میں سوچتا اوج سے سوری کر لوں اور آئندہ اس طرح نہ کرنے کا عہد کر لوں۔ لیکن پھر پتا نہیں کیا ہو جاتا۔ جب وہ میرے سامنے ہوتی تو غیر ارادی طور پر میرا رویہ اس کے ساتھ سخت ہو جاتا۔ اس کی آنکھوں میں حیرانی اترتی اور پھر وہ نارمل ہو جاتی۔ اس نے ہر وہ کام کیا۔ جو میں نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں نمی اور چہرے پر بے بسی دیکھ کر مجھے بڑی کمینی سی خوشی ہوتی تھی۔ حالانکہ اس نے میرا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ ایک بار اس نے کہا تھا۔

''سکندر! میں تمہاری بیوی ہوں۔ تم مجھے اپنی مرضی اور چاہت سے بیاہ کر لائے ہو۔ پھر ایسا کیوں کرتے ہو؟ اگر تمہیں کوئی الجھن ہے تو مجھ سے شیئر کر لو' کوئی پرابلم ہے تو ہم دونوں مل کر حل کر لیتے ہیں۔ لیکن خدا کے لئے زندگی کو جہنم مت بناؤ اپنے لئے بھی اور میرے لئے بھی۔''

لیکن میں نے زندگی کو جہنم بنا دیا تھا۔ اپنے لئے بھی اور اس کے لئے بھی۔ وہ اکثر اپنے ماضی اور بچپن کا ذکر کرتی تھی لیکن میں نے کبھی اپنے بچپن یا ماضی کا ذکر اس سے نہیں کیا تھا۔ میرا ماضی اور میرا بچپن خوشگوار نہ تھا۔ اگر کہیں کوئی خوشگواریت تھی بھی تو زائل ہو چکی تھی۔

مجھے صرف یہ یاد تھا کہ حمید اللہ کے مرنے کے بعد نجیب اللہ نے ہمیں گھر سے نکال دیا تھا اور ہم ایک گنجان محلے کے چھوٹے سے گھر میں رہنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ میں یہ بھول چکا تھا کہ جب حمید اللہ علوی زندہ تھا تو اس نے میرے کتنے لاڈ اٹھائے تھے۔

جب اوج کہتی کہ ''ڈیڈی مجھے ہمیشہ ساتھ لے کر جاتے تھے کہیں بھی جانا ہوتا' انہوں نے میرے لئے دنیا جہاں کے کھلونے اور گیمز خرید کر رکھے ہوئے تھے۔''

تو میری رگوں میں آگ دوڑنے لگتی۔

مجھے بالکل یاد نہیں تھا کہ اتنی چھوٹی سی عمر میں ہی حمید اللہ نے میرے لئے ایک سے

ایک قیمتی چیز خریدی تھی۔

مجھے تو صرف اتنا پتا تھا کہ جب اسمارا علوی ٹی وی پر پلے اسٹیشن لگا کر ریموٹ ہاتھ میں پکڑتی تھی تو مجھے کھڑے دیکھ کر وہاں سے بھگا دیتی۔ مجیب اللہ یا نجیب اللہ ہوتا تو ایک آدھ تھپڑ بھی لگا دیتا۔ مجھے یہ یاد نہیں تھا کہ افزا علوی مجھ سے کتنی محبت کرتی تھی ہاں میرے اندر یہ دکھ زندہ تھا کہ افزا علوی مجھے تن تنہا دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود مزے سے ہمیشہ کی نیند سو گئی تھی۔ اور اس کے بعد میرے لئے کیا رہ گیا تھا۔

صرف گالیاں

دھکے' کے' اور لاتیں۔

جب اوج اپنے بھائی کا ذکر کرتی جو اس کا سگا بھائی نہ تھا تو اس کی محبت کی چمک اس کی آنکھوں سے پھوٹتی اور لفظوں سے ظاہر ہوتی تو مجھے اپنا ماجد خان یاد آ جاتا جو میرا سگا بھائی تھا لیکن جو زندہ نہیں تھا' میں اس کی محبتوں کو انجوائے نہیں کر سکتا تھا جب کہ وہ اس بھائی کی محبتیں انجوائے کر رہی تھی جو اس کا سگا بھائی بھی نہ تھا۔

میں بھول گیا تھا کہ اسی دنیا میں نرس آنٹی' سرجان اور لیزا بھی تھے۔ جن کی محبتیں اور شفقتیں میرے لئے تھیں۔ بہت سارے لوگ اس دنیا میں تنہا رہ جاتے ہیں۔ بے یار و مددگار اور کوئی ان کا ہاتھ تھامنے والا نہیں ہوتا اور وہ اس دنیا کے اندھیروں میں کھو جاتے ہیں۔ جب کہ میں تو خوش قسمت تھا کہ مجھے نرس آنٹی مل گئی تھیں۔ سرجان مل گئے تھے اور لیزا مل گئی تھی۔ لیکن میں نے خود کو کبھی خوش قسمت نہ جانا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ میں زیادہ ایگریسو ہوتا جا رہا تھا۔

میں نے اوج کی جاب چھڑوا دی۔

ٹیلنٹ ضائع نہیں کرنا چاہئے لیکن میں نے کہا۔

''وہ میری بیوی ہے اور ایک بیوی کے لئے بہترین مقام اس کا گھر ہے۔ آپ نے اس کی صلاحیتوں سے بہت فائدہ اٹھا لیا اب کسی اور کو موقع دیجئے دنیا میں ٹیلنٹ کی کمی نہیں ہے۔''

میرا لہجہ گستاخانہ تھا لیکن سعد خان نے مسکرا کر نظر انداز کیا۔

''او کے...... جنٹلمین۔''

میں نے اسے گھر تک محدود کر دیا۔ اسے میکے جانے سے روک دیا۔

''مجھے تمہارا روز روز میکے جانا پسند نہیں ہے۔''

حالانکہ میں جانتا تھا کہ وہ پندرہ بیس دن کے بعد ہی میکے جاتی ہے۔ ایک ہی شہر میں رہ کر جب وہ مہینوں میکے نہ جا پاتی تو میں اس کی بے بسی اور جھنجھلاہٹ سے لطف اٹھاتا۔ اس کی آنکھ کی نمی مجھے محظوظ کرتی اور پھر کبھی کبھی ازراہِ کرم میں اسے تیار ہونے کو کہہ دیتا۔ تو وہ کھل اٹھتی۔ اور منٹوں میں تیار ہو جاتی' تب مجھے یاد آتا کہ ''مجھے تو ایک ضروری کام سے جانا تھا۔ خیر کل چلیں گے۔''

اس کی آنکھوں کی روشنیاں بجھ جاتیں۔ اور میرا جی چاہتا میں رقص کے انداز میں دونوں ہاتھ پھیلائے گول گول گھوم جاؤں۔

اور پھر میں اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دزدیدہ نظروں سے دیکھتا' بے بسی سے ہونٹ کاٹتی ہوئی اوج کمال کو دیکھ کر مجھے اپنا بچپن یاد آ جاتا۔ جب مجھے پیپر کی تیاری کرنا ہوتی اور غلطی سے نجیب اللہ کو پتا چل جاتا اس رات وہ بہانے سے مجھے رات گئے تک الجھائے رکھتا۔ سارے کام ختم ہو جاتے تو سر پر مالش کرنے کو کہہ دیتا۔ وارڈ روب سے کپڑے نکال کر [illegible] نکال کر پالش کرنے کا حکم دیتا اور میں یونہی بے بسی سے ہونٹ

کاٹتا کام کرتا رہتا۔ اور وہ میری اس کیفیت سے یوں ہی محظوظ ہوتا جیسے۔ میں اوج کو دیکھ کر محظوظ ہوتا تھا' اب گیند میرے کورٹ میں تھی لیکن مقابل نجیب اللہ نہیں اوج تھی لیکن شاید میں نے اسے نجیب اللہ ہی سمجھ لیا تھا۔ کبھی کبھار میں اسے انتظار کرنے کا کہہ کر چلا جاتا' وہ تیار ہو کر انتظار کرتی رہ جاتی اور میں گھر آنا بھول جاتا۔

''سوری اوج! میں ذرا اسد کی طرف چلا گیا تھا اور وہاں یاد ہی نہیں رہا کہ ہمیں انکل کی طرف جانا ہے۔ چلو کل چلیں گے۔''

میں بڑے اطمینان سے جواز دے کر پُرسکون سا ہو جاتا اور وہ بے بسی سے ہونٹ کاٹتی رہ جاتی۔ وہ جتنا کمزور پڑتی' بے بس دکھتی' میں اتنا ہی جابر ہوتا جاتا تھا۔ اور پھر تو میں نے حد ہی کر دی۔

بلال آسٹریلیا سے آیا ہوا تھا۔ وہ ایک بہت اچھی نیچر کا خوش مزاج لڑکا تھا۔ اوج کے ساتھ اس کی بہت دوستی تھی۔ اوج اور میں دو تین بار ہی اس سے ملنے گئے تھے' وہ بھی جس روز وہ آیا تھا اور دوبار دعوت پر لیکن وہ ہر روز ہی آ دھمکتا تھا۔ اور پھر گھنٹوں بیٹھا اوج سے باتیں کرتا رہتا۔ اوج اس کی باتوں پر ہنستی رہتی۔ مسکراتی رہتی۔ اس کی پسندیدہ ڈشیں بناتی اور میں کڑھتا رہتا۔

بلال کی اپنی سگی بہن کوئی نہیں تھی۔ وہ چھ بھائی تھے' بلال کا نمبر چوتھا تھا اور اسے اوج کی امی نے گود لیا تھا۔ اور اوج پر وہ جان چھڑکتا تھا۔ میں یہ سب جانتا تھا' مجھے یہ بھی پتا تھا کہ اوج کے باقی پانچوں ماموں زاد بھی اس پر جان چھڑکتے ہیں۔ اس کے ماموں ممانی اس کے چچا' اس کی چچیاں' اس کے کزن سب ہی ایک دوسرے سے بہت محبت رکھتے تھے اس کے باوجود میں بلال کے جانے کے بعد اس پر طنز کرتا۔

''یہ انوکھی محبت ہے بھئی ماموں زاد کی' ہم نے تو کبھی ایسی محبت نہیں دیکھی۔ صبح سے

شام تک دھرنا مار کر بیٹھے رہتے ہیں صاحبزادے''

''وہ میرا ماموں زاد ہی نہیں بھائی بھی ہے۔''

وہ مجھے بتاتی' میں طنزیہ انداز میں کندھے اچکاتا۔

''ہماری فیملی میں بہت محبت ہے' ایک دوسرے سے ابھی آپ میرے دوسرے کزنز سے نہیں ملے نا''

وہ نرمی سے کہتی اور میرے اندر کوئی چٹکی لیتا۔ میں کتنا اکیلا تھا اور اس سے اتنے لوگ تھے محبت کرنے والے۔

''بس مجھے پسند نہیں ہے اس کا زیادہ یہاں آنا۔ منع کردو۔ آفس سے تھکا ہارا آؤں اور آگے یہ ہاہا ہو ہو مچی ہوتی ہے۔''

وہ ہونٹ کاٹ کر رہ جاتی اور آنکھوں کی نمی چھپانے کے لئے ادھر ادھر ہو جاتی۔ اور اس کی یہ بے بسی' اور آنکھوں کی نمی میرے اندر چٹکی لیتے درد کے لئے مرہم بن جاتی میں اپنی بات کہہ کر بڑے سکون سے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی کے آگے بیٹھ جاتا یا پھر کوئی میگزین یا اخبار لے کر اپنے بیڈ روم میں گھس جاتا۔ کئی بار میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ رو کر آئی ہے۔ شاید کچن میں کام کرتے ہوئے یا پھر واش روم میں جا کر۔ وہ خاموشی سے کھانا تیار کر کے ٹیبل پر لگا دیتی اور پھر مجھے بلاتی اور نارمل طریقے سے کھانا پیش کرتی۔

''یہ لیں نا سکندر! یہ کوفتے بہت مزے کے ہیں میں نے اپنی دادی اماں سے بنانے سیکھے تھے۔''

وہ کوفتے واقعی بہت مزے کے بناتی تھی' بالکل افزا علوی کی طرح۔

یہ اور اس طرح کے جملے وقتاً فوقتاً اس کے منہ سے نکلتے رہتے کبھی کبھار میں حیران ہوتا کہ کس مٹی کی بنی ہے۔ نہ مجھ سے لڑتی ہے' نہ احتجاج کرتی ہے میرا ہر ظلم خاموشی سے

برداشت کر لیتی ہے۔

''کیا..... کیا..... اوج کمال مجھ سے محبت کرتی ہے۔؟''

میں سوچتا اور پشیمان ہو جاتا اور اپنے رویے کی تلافی کے لئے اسے باہر لے جاتا۔ آئس کریم کھلاتا۔ گجرے خرید کر دیتا۔ آفس کے معاملات اس سے شیئر کرتا۔ لیکن پھر وہی وحشت عود کر آتی۔

اور مجھے یاد نہ رہتا کہ میں نے خود سے عہد کیا تھا کہ اب اسے زچ نہ کروں گا۔

♥ ♥ ♥ ♥

اس دن آفس سے آیا تو بلال اور وہ ٹی وی۔ لاؤنج میں بیٹھے چلغوزے کھاتے ہوئے نہ جانے کس بات پر زور زور سے ہنس رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بلال نے سرگوشی میں کچھ کہا تھا۔ اور پھر ایک آنکھ بند کرتے ہوئے مسکرا دیا تھا اور ہمیشہ کی سی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔

''او کے سکندر بھائی! میں چلتا ہوں' شام کو آپ لوگ ادھر آیئے گا۔ میں نے اوج کو بتا دیا ہے سب کچھ۔''

''ارے یہ کیا..... میں آیا ہوں اور تم چل دیئے۔''

میں نے مصنوعی خوش اخلاقی سے کہا۔

''نہیں بھائی! ضروری کام ہے۔''

وہ ہاتھ سے وکٹری کا نشان بنا کر اوج کو دکھاتا تیز تیز قدموں سے باہر چلا گیا۔ اور خون میری کنپٹیوں پر ٹھوکریں مار رہا تھا۔ میں نے ہاتھ میں پکڑا بریف کیس اچھال کر پھینکا جو

اس کے گھٹنے پر لگا اور اس نے سہم کر مجھے دیکھا۔

میرا موڈ بہت خراب تھا۔ آج آفس میں بلا وجہ ہی مسٹر ڈی سوزا سے چخ چخ ہو گئی تھی یہ سینٹری انجینئر تھا اور چند ماہ قبل ہی نیو یارک سے آیا تھا نسلاً برٹش تھا اور اپنی ذہنیت کے مطابق آج بھی ہمیں غلام سمجھتا تھا۔ اس کا انداز پاکستانی انجینئرز سے باتیں کرتے ہوئے انتہائی حقارت کا ہوتا تھا۔ اور اپنی غلامانہ ذہنیت کی بنا پر بعض کولیگز کو اس کے سامنے بس سر لیس سر کرتے دیکھ کر میرے وجود میں آگ لگ جاتی تھی۔ اسے براہ راست ہیڈ آفس سے بھیجا گیا تھا' اور وہ اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتا تھا۔ اس روز اس نے ایک جونیئر انجینئر کو اس کی معمولی سی غلطی پر گالی دے دی۔ میں سائیٹ پر موجود تھا' میں نے ایک مکہ اس کے جبڑے پر لگایا۔

''آئندہ کسی ماتحت کو گالی مت دینا۔''

جواباً اس نے ایک اور گالی! اگل دی جو میرے لئے تھی پھر تو میرا دماغ الٹ گیا۔ فوراً ہی لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا ورنہ وہ ہاسپٹل میں پڑا ہوتا۔ اب بھی اس کا منہ سوج گیا تھا اور ہونٹ کٹ گیا تھا۔ سعد خان یقیناً میری یہ غلطی معاف نہیں کرے گا۔ میں جانتا تھا اس لئے میں سائیٹ سے سیدھا گھر آ گیا تھا اور یہاں اوج کو خوش دیکھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔

''اچھا تو میری عدم موجودگی میں یہ گل چھرے اڑائے جاتے ہیں۔'' اوج کا رنگ یکدم زرد پڑ گیا۔

''سکندر ..... !''

''تمہیں امید تو نہیں ہوگی کہ میں اس طرح اچانک گھر آ جاؤں گا۔ اور تمہارا وہ نام نہاد بھائی مجھے دیکھتے ہی بھاگ کھڑا ہوا۔''

''سکندر ...... ! اس کی آواز گھٹ گئی اور پورا وجود کانپنے لگا۔'' تم .... سکندر تم

نفسیاتی مریض ہو۔اذیت پسند ہو' تم ...... تم...... ''

یکدم اس نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپالیا' اور تقریباً بھاگتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔ میں وہاں ہی تھکا تھکا سا صوفے پر گرا پڑا۔ اور دل ہی دل میں ڈی سوزا کو گالی دی۔

ابھی تک ہمیں غلام سمجھتے ہو۔''

اور ریلیکس ہونے کے لئے آنکھیں بند کرلیں۔ کچھ دیر یونہی آنکھیں بند کیے پشت سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا' پھر آہٹ پر آنکھیں کھول دیں۔ اوج بیگ اٹھائے کمرے سے نکل رہی تھی۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''میں جارہی ہوں.....''

''کہاں......؟''

''اپنے گھر' اپنے والدین کے گھر ہمیشہ کے لئے۔

اس بیگ میں صرف چند جوڑے کپڑے ہیں۔ آپکی کوئی چیز ساتھ لے کر نہیں جا رہی۔''

وہ جاتے جاتے مڑی اور گلے سے لیزا والا لاکٹ اتار کر ٹیبل پر رکھ دیا۔ اور تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔ اور میں وہیں بیٹھا سوچتا رہا کہ آخر آج ایسی کیا انہونی بات ہوگئی ہے کہ وہ خفا ہو کر جارہی ہے۔ یقیناً وہ خفا ہو کر ہی گئی ہے۔ ورنہ لاکٹ کبھی نہ دیکر جاتی۔ میں نے ٹیبل سے لاکٹ اٹھا کر مٹھی میں بند کرلیا جو اس کی وجود کی حدت سے ابھی تک گرم تھا' میں تو اس سے بھی زیادہ اسے ڈانٹتا ڈپٹتا رہتا ہوں لیکن آج..... خیر خود ہی چند روز تک آجائے گی۔ میں نے لاکٹ دراز میں ڈال دیا۔ اور خود اسد کی طرف چلا گیا۔

میں نے واقعی بلال کے حوالے سے بہت گری ہوئی بات کی تھی۔ مجھے اس طرح کی بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔ لیکن بخدا میرا حقیقت میں یہ مطلب ہرگز نہ تھا۔ میں نے تو یونہی اپنا غصہ فرد کیا تھا۔ بے سوچے سمجھے کچھ کہہ کر۔

مجھے اس کے کردار پر کبھی شبہ نہیں ہوا تھا' اس کا کردار میرے سامنے تھا' اس نے میرے ساتھ اتنا عرصہ کام کیا تھا دفتر کا ہر کارکن اس کی عزت کرتا تھا' میں جانتا تھا اس نے اور بلال نے ایک ہی گھر میں بہن بھائیوں کی طرح پرورش پائی ہے۔ اگر کوئی مسئلہ ہوتا تو بھلا کیا رکاوٹ تھی۔ میں نے سب کچھ بلا ارادہ کیا تھا۔ مجھے عادت ہوگئی تھی اسے زچ کرنے کی ورنہ آج تو ڈی سوزا کے ساتھ جھگڑے کی وجہ سے میں اس کے رونے اور آنسوؤں کو بھی انجوائے نہیں کرسکتا تھا۔

سب کچھ بلا ارادہ ہوا تھا لیکن اب وہ جا چکی تھی رات گئے جب میں اسد کے گھر سے آیا تو گھر پر تالا دیکھ کر کوفت ہوئی۔ گھر کے اندر بھی سناٹے تھے۔ میں خاموشی سے جا کر بیڈ روم میں لیٹ گیا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد میرا دل گھبرانے لگا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رات گئے تک اس کی موجودگی کا احساس ہوتا رہتا تھا۔ اسے زیورات سے دلچسپی نہ تھی ویسے سے اگلے روز ہی اس نے سارے زیور اتار کر لاکر میں رکھوا دیے تھے۔ بس ایک لاکٹ جو میں نے رونمائی میں دیا تھا اور ایک انگوٹھی پہنے رکھتی تھی۔ لیکن اسے کانچ کی چوڑیوں کا شوق تھا۔ رنگ برنگی چوڑیاں کلائی میں سجائے رکھتی۔ اور ادھر ادھر جاتے ہوئے اس کی چوڑیوں کی کھنک مجھے اچھی لگتی تھی۔ میں نے اس جلترنگ کو سننے کی شدید خواہش اپنے دل میں محسوس کی۔ اور بیڈروم سے اٹھ کر ٹی وی لاؤنج میں آبیٹھا۔ لیکن یہ جلترنگ کہیں سنائی نہ دیتا تھا۔

میں نے اٹھ کر اپنے لئے چائے تیار کی۔ وہ کچن کا سارا کام خود کرتی تھی۔ حالانکہ میں نے کئی بار کہا بھی تھا کہ کسی کو ملازم رکھ لے۔ لیکن اس نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ بس صفائی کے لئے صبح صبح ایک عورت آتی تھی۔

چائے کا کپ لے کر میں اپنے بیڈروم میں آیا تو کسی اندرونی جذبے سے بے قرار ہو کر میں نے اس کے گھر کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف اس نے خود ہی اٹھایا تھا۔ اور میری آواز سن کر ریسیور رکھ دیا۔ وہ مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ حالانکہ میں اس سے معذرت کرنا

چاہتا تھا' اسے بتانا چاہتا تھا کہ میں غصے میں تھا اور یوں غصے میں الٹا سیدھا بک گیا تھا۔ مگر وہ تو بات ہی نہیں کرتی تھی۔

اگلے دو ہفتے میں مسلسل اسے رنگ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ جو بھی ریسیو اٹھاتا۔ شائستگی سے کہہ دیتا کہ ''اوج! مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتی۔''

اس دوران اسد اور بھابی کو بھی اس ناراضگی کا پتا چل چکا تھا اور اپنے طور پر دونوں کوشش کر چکے تھے' میری توقع کے برعکس سعد خان نے مجھے جاب سے نکالنے کے بجائے میرا ٹرانسفر کراچی آفس میں کر دیا تھا۔ میں وہاں جانا نہیں چاہتا تھا لیکن سعد خان کے سامنے انکار نہ کر سکا۔ اس نے جس طرح ڈی سوزا والے معاملے پر مجھے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا اس نے مجھے اندر ہی اندر شرمندہ کر دیا تھا۔

''یہ ٹرانسفر عارضی ہے' صرف چند ماہ کے لئے۔''

اس نے مجھے متذبذب دیکھ کر کہا۔ اور میرا کندھا تھپک کر چلا گیا۔

♥ ♥ ♥ ♥

اس روز میں آفس سے نکلا تو گھر جانے کے بجائے اوج کی طرف چل پڑا۔ فون پر بات نہیں سنتی تھی لیکن جب میں اس کے سامنے جا کر کھڑا ہوں گا' ہاتھ جوڑ دوں گا تو وہ ضرور من جائے گی۔ مجھے یقین تھا۔ اور جب میں اسے بتاؤں گا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ بہت شدید محبت لیکن اس کا انکشاف مجھ پر اب ہو رہا ہے تو اس کی آنکھیں لو دے اٹھیں گی۔ رخساروں پر شفق اتر آئے گی۔

ہاں مجھ پر ان دو ہفتوں میں انکشاف ہوا تھا کہ میں نے اوج کمال سے اس لئے شادی کی کہ میں اس سے محبت کرتا تھا۔ وہ صحیح کہتی ہے کہ مجھے اپنے آپ کو کھوجنا چاہئے۔ میں نے اپنے آپ کو کھوجا ہے۔ اور مجھے پتا چلا ہے کہ میرے اندر کتنے نفسیاتی گنجل ہیں' کتنی گرہیں ہیں۔

میں اسے بتاؤں گا کہ میں نے ڈاکٹر صدیقی کو جوائن کیا ہے اور میں تین دن سے

مسلسل ان کے ساتھ میٹنگ کر رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے میں بہت جلد اپنی خامیوں پر قابو پا لوں گا۔ ڈاکٹر صدیقی کہتے ہیں مجھ میں بہت ول پاور ہے۔

''آئی لو یو اوج! آئی لو یو.....''

میں نے دل میں کتنی بار زیر لب کہا۔ میں اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا' حالانکہ میں جھکنے جا رہا تھا لیکن میری غلطی تھی۔ اور اس جھکنے میں بہت لطف تھا۔ مگر گیٹ پر بڑا سا تالا میرا منہ چڑا رہا تھا۔ واپسی کا سفر بہت تھکا دینے والا تھا۔ اسد کے گھر سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ لوگ بلال کی شادی کے سلسلے میں فیصل آباد گئے ہوئے ہیں۔

بلال کے حقیقی والدین فیصل آباد میں ہی رہائش پذیر تھے۔ اسد کے گھر سے رات کا کھانا کھا کر میں واپس گھر آیا تو بہت اداس تھا۔ پھر بھی پر امید تھا کہ کراچی جا کر چند دن بعد ایک دو روز کے لئے آؤں گا اور اوج کو منا لوں گا۔ لیکن کراچی پہنچنے کے دو تین دن بعد ہی سعد خان نے فوراً ابوظہبی آفس پہنچنے کے لئے کہا۔

''بہت بڑا پروجیکٹ ہے سکندر! نہ صرف یہ کہ یہ پروجیکٹ لینا ہے بلکہ اس پروجیکٹ کو تم ہی ہینڈل ہی کرو گے۔ دو تین روز میں تمہارا ویزا اور ٹکٹ پہنچ جائے گا۔''

جانے سے پہلے میں نے چاہا کہ اوج سے بات ہو جائے لیکن وہاں سے کوئی ریسیو نہیں کر رہا تھا پھر ابوظہبی سے بھی کئی بار میں نے ٹرائی کیا۔ بس بیل ہوتی تھی لیکن کوئی ریسیو نہیں کرتا تھا۔ یا تو انہوں نے وہ گھر چھوڑ دیا تھا یا پھر نمبر بدل گیا تھا۔ تنگ آ کر میں نے رنگ کرنا چھوڑ دیا۔ البتہ اسد سے میں نے رابطہ رکھا ہوا تھا۔ اسد نے ہی مجھے بتایا کہ وہ اسی گھر میں ہیں البتہ کافی دن فیصل آباد رہے ہے۔

میں نے سوچا ایک دفعہ پروجیکٹ کا کام شروع ہو جائے تو تین چار دن کی چھٹی لے کر جاؤں گا اور اوج کو منا لوں گا۔ لیکن اگر وہ من گئی میرے ساتھ آ گئی تو کیا میں پھر اس کے

ساتھ ویسا ہی نہیں کروں گا' جیسا پہلے کرتا تھا۔

اس نے کہا تھا میں نفسیاتی مریض ہوں۔

مجھے ڈاکٹر صدیقی سے اپنی سٹنگ مکمل کرنی چاہئے۔ مجھے اپنے اندر موجود گنجل کھولنے چاہئیں۔ تب' تب جانا چاہئے اوج کے پاس۔

جب کامیابیاں حاصل کرنے والے لوگ مجھے برے نہ لگیں۔

جب اوج کی بااعتمادی پر مجھے فخر محسوس ہو۔

جب بے بس اور مجبور لوگوں کو دیکھ کر مجھے تسکین نہ ہو۔

ہاں' میں اپنا علاج کرواؤں گا' اس لئے کہ میں اوج کے بغیر نہیں رہ سکتا' میں جانتا ہوں' میں نے جان لیا ہے۔

پراجیکٹ مکمل ہوتے ہی میں پہلے ڈاکٹر صدیقی کے پاس جاؤں گا اور پھر اوج کے پاس' میں نے فیصلہ کر لیا۔

ایک دن اسد نے مجھے بتایا کہ اوج نے کتنی ہی بار فون کر کے اس سے میرے متعلق پوچھا ہے۔

''یار! بھابی کا غصہ اتر گیا ہے۔ لیکن بات کیا ہوئی تھی۔ بھابی تو اس طرح غصے سے گھر چھوڑ کر آنے والی نہیں تھیں۔''

اسد نے پوچھا تھا' تب میں نے مختصراً اسد ملک کو اپنے متعلق سب کچھ بتا دیا' اسد کو پہلے بھی اندازہ تھا' کچھ وہ جانتا تھا کہ میں وہاں ہالینڈ میں بھی کبھی کبھی کتنا اگریسو ہو جاتا تھا ایک بار تو میں نے لیزا کو غصے میں دھکا دے دیا تھا اور وہ سیڑھیوں سے گر پڑی تھی۔ حالانکہ وہ سرجان کی بیٹی تھی۔ جو میرے محسن تھے۔

''لیکن دوست! ساری زندگی تو اس طرح نہیں گزر سکتی اپنے آپ کو بدلو۔''

''بدلنا چاہتا ہوں اسد! میں سمجھتا ہوں کہ مجھے کسی نفسیاتی معالج کی ضرورت ہے اور میں اس وقت اوج کے پاس جانا چاہتا ہوں جب میں اپنی ذات کے اس حصار کو توڑ دوں گا جو مجھے مکمل طور پر خوش نہیں ہونے دیتا۔''

اور میں نے اسد ملک سے درخواست کی کہ وہ اوج کو میرے متعلق نہ بتائے اور یہ اسد ملک ہی تھا جس کی وجہ سے اوج کو آفس سے بھی میرے متعلق صحیح معلومات نہیں مل سکیں۔ اور میں جلدی جلدی اپنا پروجیکٹ مکمل کرنے کی کوشش میں لگا ہوں' دن رات تا کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے واپس جا کر اپنا علاج کرواسکوں' اور ماضی کی ساری تلخیوں کو بھلا کر سارے حصار توڑ کر اوج سے ملوں۔

♥ ♥ ♥ ♥

اور کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی بے قصور ہوتے ہوئے بھی خود کو قصوروار سمجھنے لگتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے میں خود کو قصوروار سمجھ رہا ہوں۔ حالانکہ میرا کوئی قصور نہیں۔ لیکن جب سکندر علوی نے میرے ایک سوال کے جواب میں نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا تھا اور اس کے ہونٹ زہر میں بھیگ گئے تھے۔

''میری والدہ کے قریبی عزیزوں نے ان کی شادی ایک ایسے شخص سے کر دی جو نہ صرف پہلے سے شادی شدہ تھا بلکہ تین بچوں کا باپ بھی تھا۔ اگر وہ ان کی اپنی سگی بیٹی ہوتی تو وہ ایسا ہرگز نہ کرتے۔ حالانکہ افزا علوی ان کی بہت تعریف کرتی تھی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے میری ماں کے ساتھ ظلم کیا اگر وہ یہ ظلم نہ کرتے تو میرے ساتھ وہ سب کچھ نہ ہوتا جو ہوا تھا۔''

''افزا علوی'' کے نام نے مجھے چونکا دیا۔ میرا دل ایک لمحہ کو جیسے کہیں پاتال میں گر

گیا۔ افزا ..... یہ نام آج بھی میرے اندر ہلچل مچا دیتا تھا جب کہ میں صبا کے ساتھ ایک مکمل اور بھرپور زندگی گزار رہا تھا' میری ایک بیٹی تھی اوج کمال۔

''میری محرومیوں کا حاصل۔''

''میری حیات کی روشنی۔''

''میرے زندہ رہنے کا جواز۔''

اور یہ سکندر علوی اسی اوج کمال کا پروپوزل لے کر آیا تھا۔ مجھے یہ نوجوان اچھا لگا تھا 'اس کی شخصیت اور ذہانت نے مجھے متاثر کیا تھا۔ یہ ہر لحاظ سے اوج کے قابل تھا۔ اوج بھی تو کچھ کم ذہین نہیں تھی۔ لیکن اس سے افزا علوی کے ان عزیزوں کا ذکر کرتے ہوئے اس کی آنکھوں سے نفرت کی جو آگ نکل رہی تھی' اس نے ایک لمحہ کے لئے مجھے اندر تک ہلا دیا۔

''تمہارے والد کا نام بیٹا؟'' مجھے خود اپنی آواز میں کپکپی سی محسوس ہوئی۔

''حمید اللہ علوی۔!'' اس کی آنکھوں میں ابھی بھی وہی تنفر تھا اور مجھے لگا جیسے میں اندر تک جل اٹھا ہوں راکھ ہو گیا ہوں۔ میرا دل چاہا اس سے کہوں......

''بیٹا اپنی نگاہیں جھکا لو تمہاری آنکھوں کی یہ نفرت مجھے بھسم کیے دے رہی ہے۔''

لیکن میرے لب سل گئے تھے' اور حلق میں جیسے کانٹے اگ آئے تھے میں نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر اس کی طرف دیکھا۔ تو اس نے نظریں جھکا لی تھیں۔ اور چہرے پر وہی پہلے کا سا تاثر ابھر رہا تھا۔

وہی تاثر جس میں ایک حزن تھا۔

ملال تھا۔

اور عجیب طرح کی ملاحت تھی۔

اور یہی تاثر پہلی بار میں نے افزا کے چہرے پر دیکھا تھا' جب وہ بابا اور اماں کے ساتھ ہمیشہ کے لئے ہمارے گھر رہنے آئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ملال کے رنگ تھے اور

چہرے پر ایک حزن کی سی کیفیت تھی۔ اس سے پہلے بھی کئی بار میں نے افزا کو اس کے گھر میں دیکھا تھا تو وہ مجھے ایک معصوم سی بچی لگتی تھی اپنے بابا کے کام دوڑ دوڑ کر کرتی ہوئی۔ لیکن اس روز جب بابا نے مجھے بتایا کہ افزا کو وہ اپنے ساتھ لے آئے ہیں ہمیشہ کے لئے تو اس کی آنکھوں کی سیاہیوں میں یکدم پانی پھیلتا چلا گیا تھا اور وہ ہونٹ کاٹتی ہوئی ضبط کی انتہائی حدوں سے گزر رہی تھی۔ میں کتنی ہی دیر تک اس کے چہرے سے نگاہیں نہیں ہٹا سکا تھا۔

اس کے آنے سے گھر میں بہت تبدیلی آ گئی تھی۔

جہاں اماں کی برسوں پرانی بیٹی کی خواہش پوری ہوئی تھی وہاں جمال اور نہال کے عیش ہو گئے تھے۔

انہیں اپنے کپڑے استری کیے کرائے مل جاتے تھے۔

جوتوں پر پالش کی ہوتی۔ بہت سارے کام جو اماں اکیلا ہونے کی بنا پر وقت پر نہ کر پاتی تھیں' افزا کے آنے سے وقت پر ہونے لگے تھے۔

گیلے تولیے اور کپڑے جو صوفوں پر پڑے رہتے تھے' اپنی صحیح جگہ پر ملنے لگے تھے۔

گھر کے اندر یہ تبدیلی بہت خوش کن تھی۔ لیکن جو تبدیلی میرے اندر ہوئی تھی' وہ بہت خوبصورت اور دلکش تھی میرا دل ایک انوکھے جذبے سے روشناس ہوا تھا۔ اور ایک نئی تال پر دھڑک رہا تھا۔ میں جب رات کو بستر پر لیٹتا تو میری آنکھوں کے سامنے اس کا سراپا آ جاتا۔

اماں کے ساتھ مل کر کام کرتے ہوئے۔

نہال سے جھگڑتے' جمال سے گپ لگاتے ہوئے۔

اور بابا کے آفس سے آنے کے بعد بھاگ بھاگ کر ان کے کام کرتے۔

کبھی چائے لا رہی ہے' کبھی ان کے کپڑے اور کبھی ان کے پاؤں دبا رہی ہے۔ وہ منع کرتے رہتے لیکن وہ دباتی رہتی۔

''بابا! آپ تھک گئے ہوں گے۔''

بہت جلد وہ اس گھر میں اس طرح رچ بس گئی تھی جیسے ہمیشہ سے یہاں ہی رہتی آ رہی ہو اور خود مجھے تو یوں لگتا تھا جیسے وہ ازل سے میری رگوں میں زندگی بن کر دوڑ رہی ہے۔

نہال کی پیاری بجو' جمال کی بہن ہی نہیں دوست بھی اماں اور ابا کی پیاری بیٹی۔

اور میرے لئے وہ کیا تھی' مجھے خود خبر نہ تھی۔ میں کالج سے آتا اور وہ نظر نہ آتی تو میں بے چین ہو جاتا جب تک وہ دکھائی نہ دیتی' مضطرب رہتا۔

زندگی کے رنگ ہی بدل گئے تھے۔ عام دنوں کے علاوہ یوں لگتا تھا جیسے تہوار بھی حسین ہو گئے ہوں۔

افزا کی تیاریاں' اسے چاندرات میں شاپنگ کے لئے لے کر جانا' اس کے لئے چوڑیاں خریدنا۔

نہال اور جمال اس میں بہت پیش پیش ہوتے' میرے ساتھ وہ بہت بے تکلف نہ تھی۔ لیکن یہ بھی نہیں تھا کہ ہمارے درمیان کوئی تکلف ہو۔ یا اجنبیت ہو۔ بس خود بخود ہی وہ جذبہ جس نے میرے دل و جان کو روشن کر رکھا تھا۔ مجھے اس سے اس طرح بے تکلف نہ ہونے دیتا جس طرح نہال اور جمال تھے۔ حالانکہ وہ میرے کپڑوں' جوتوں اور دوسری ضروریات کا اسی طرح خیال رکھتی تھی۔ جس طرح نہال اور جمال کا۔

صبح صبح جب میں نہال اور جمال کو ان کے کالج ڈراپ کر کے اسے اس کے کالج ڈراپ کرتا تو وہ مسلسل بولتی رہتی۔ نہال کی شرارتیں۔

جمال کی بولڈنیس' کالج کی سہیلیوں کی باتیں اور میرا جی چاہتا سفر لمبا ہو جائے اور میں تمام عمر اس کی دلکش آواز سنتا رہوں۔ لیکن اس کا کالج آ جاتا اور وہ کالج پر اترتے ہوئے ہمیشہ کہتی۔

''سوری کمال بھائی! میں نے آپ کو بور کیا۔ آپ تو اتنے کم گو ہیں' لفظ بھی سوچ سوچ کر بولتے ہیں اور میں اتنی باتونی ہوں' سچ بتائیں' آپ بور ہوئے؟''

''نہیں بالکل نہیں' مجھے تمہارا بولنا اور تمہیں سننا بہت اچھا لگتا ہے۔''

اور اس کی آنکھیں جگمگ جگمگ کرنے لگتیں۔ ''سچ بھائی۔''

اس کی آنکھیں بہت روشن اور چمکدار تھیں۔ بالکل سکندر کی آنکھوں کی طرح' سکندر کی آنکھیں بالکل افزا جیسی ہیں اور اس کے ہونٹوں کی بناوٹ بھی اور اس کے بات کرنے کا انداز بھی بالکل افزا جیسا ہے۔ ٹھہرا ٹھہرا اور دھیما دھیما سا' شاید تب ہی وہ مجھے اتنا اپنا اپنا لگا تھا۔ اور پہلی نظر دیکھتے ہی اور اس سے بات کرتے ہی میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ لڑکا اوج کے لئے بہت موزوں ہے۔

میں نے افزا سے بہت محبت کی بے حد شدید لیکن افزا ہمیشہ ان شدتوں سے بے خبر رہی۔ میں کبھی اپنے جذبوں کا اظہار نہ کر سکا۔ میں نے سوچا تھا' ابھی وہ بہت معصوم ہے جب وقت آئے گا تو میں تب ہی اپنے جذبوں کا اظہار کروں گا' ان دنوں میں اپنا گریجویشن مکمل کر چکا تھا اور میں نے ایم۔ ایس۔ سی میں ایڈمیشن کے لئے ہارورڈ یونیورسٹی میں اپلائی کیا ہوا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کے دل میں محبتوں کے چراغ جلا کر خود دو تین سال کے لئے غائب ہو جاؤں' وہاں سے واپس آ کر اماں اور بابا سے بات کر کے میں پورے استحقاق کے ساتھ اپنے جذبے اس پر ظاہر کر دوں گا۔

لیکن کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان جو سوچتا ہے وہ ہوتا نہیں ہے اور جو نہیں سوچتا وہ ہو جاتا ہے۔

میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ میرے سارے خواب تعبیر پانے سے پہلے ہی میری آنکھوں میں مر گئے جس روز میں جا رہا تھا' سب ہی اداس تھے۔ لیکن اس نے تو رو رو کر اپنی آنکھیں سجا لی تھیں۔ اور کتنی ہی بار کہا تھا کہ

''کمال بھائی! میں آپ کو بہت مس کروں گی۔''

''اور کیا میں مس نہیں کروں گا۔ تم لوگ تو سب ساتھ ہو گئے اور میں وہاں

اکیلا.....''

میں نے اسے بہلایا تھا' حالانکہ میرا جی چاہ رہا تھا۔ کہ اس کے سارے آنسو اپنی انگلیوں کی پوروں سے چن لوں اور اس سے کہوں۔

''افی! میں وہاں تمہارے بغیر ہر لمحہ بہت مشکل سے گزاروں گا' پتا نہیں کیسے؟''

''کمال بھائی!! آپ کے جانے کے بعد مجھے کالج کون ڈراپ کرے گا؟'' اس نے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا تو مجھے اس کی معصومیت پر ہنسی آ گئی۔ اور جمال نے اسے چھیڑا۔

''کمال بھائی! افی کو آپ کے جانے کا غم بالکل نہیں ہے۔ وہ اس لئے رو رہی ہے کہ اب اسے کون ڈراپ کرے گا۔''

''نہیں ..... نہیں.....'' اس نے شاکی نظروں سے جمال کو دیکھا۔'' میں کمال بھائی کو سچ مچ بہت مس کروں گی۔ یہ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ میں بہت یاد کروں گی انہیں۔''

یہ بے اختیار اور بے ساختہ اظہار مجھے اندر تک مالا مال کر گیا تھا۔

''مجھے یقین ہے افی!'' میں نے اس کی صورت آنکھوں میں اتارتے ہوئے کہا۔'' اور میں بھی تمہیں سب سے زیادہ یاد کروں گا۔''

اور پھر جہاز میں اس کی وہ صورت مسلسل میری آنکھوں میں رہی۔

آنکھوں میں جگمگاتے تارے

اور ہونٹوں پر مسکراہٹ

وہ بیک وقت مسکرا بھی رہی تھی اور رو بھی رہی تھی۔

''کمال بھائی مجھے سب سے زیادہ یاد کریں گے۔'' وہ نہال اور جمال کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی تھی۔ مان سے' فخر سے۔

اور میں نے دل ہی دل میں عہد کیا تھا۔

''افی افزا! میں تمہیں ہمیشہ سب سے زیادہ چاہوں گا.....'' میں نے تو اپنا عہد

نبھایا۔ میں نے ہمیشہ اسے سب سے زیادہ چاہا.....

وہ میرے دل میں ہمیشہ براجمان رہی' اگرچہ زندگی میں شامل نہ ہو سکی۔ وہ بڑی سی تصویر جو عید پر جمال نے مجھے بھیجی تھی جس میں وہ اماں بابا کے درمیان میں کھڑی مسکرا رہی تھی اور اماں بابا کے اردگرد نہال اور جمال تھے اور جسے میں نے انلارج کروایا تھا۔ ہمیشہ میری ٹیبل پر دھری رہتی ہے۔ کئی بار اوج اور بلال نے بچپن میں پوچھا تھا۔

''نہال اور جمال چاچو کے علاوہ یہ اس تصویر میں کون ہے؟''

اور میں نے بتایا تھا کہ ہماری ایک عزیزہ ہیں۔ اماں بابا کے ساتھ ہی رہتی تھیں۔

حالانکہ میرا دل کہتا تھا۔ کہوں

''یہ میری زندگی تھی جو چھن گئی..... اور پتا نہیں میں کیسے سانس لے رہا ہوں اس کے بغیر شاید صرف جی رہا ہوں۔

جمال اور نہال آتے تو کتنی ہی دیر تک تصویر کے پاس کھڑے رہتے۔ وہ دونوں اب بھی اسے یاد کرتے تھے۔

''یہ ہماری بہت پیاری بہن ہے۔''

ایک بار جمال نے اوج کو بتایا۔ تو اوج نے سوال کر کر کے اسے زچ کر دیا۔

''تو یہ اب کہاں ہیں؟ ہمارے گھر کیوں نہیں آتیں اور یہ کتنی خوبصورت ہیں۔ ان کی آنکھیں کتنی پیاری ہیں۔''

وہ ہمیشہ مجھ سے تصدیق چاہتی اور پھر صبا کی تائید۔

''ہاں بیٹا! یہ بہت خوبصورت ہے۔ بہت پیاری' خالہ جان اور خالو جان نے تو سگی بیٹیوں کی طرح ہی سمجھا تھا اسے لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اس کی شادی کے بعد تم لوگوں نے اس سے رابطہ کیوں نہ رکھا اور نہ ہی وہ کبھی پلٹ کر آئی۔ حالانکہ نہال اور جمال اکثر اسے یاد کرتے ہیں۔ اور نہال تو اکثر اپنے بچوں سے کہتا ہے'' تمہاری ایک پھپھو بھی رہتی ہیں

کہیں اس دنیا میں۔''

اوج سے بات کرتے کرتے صبا میری طرف متوجہ ہو جاتی' میں اس سے کیا کہتا کیا بتاتا کہ ایسا کیوں ہے۔ خود میں آج تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اماں نے ایسا کیوں کیا..... اور پھر بابا نے بھی انہیں نہیں روکا۔ اسے بیاہ کر اس کی خبر تک نہ لی۔ آخر بیٹیوں کی طرح چاہا تھا انہوں نے اسے۔

اور اماں بھی کتنے لاڈ اٹھاتی تھیں اسکے۔ پھر بھی انہوں نے اسے حمید اللہ علوی سے بیاہ دیا جو عمر میں اس سے دگنا بڑا تھا۔ جس کے بچے اس کے ہم عمر تھے۔ صرف اس لئے کہ میں اس سے شادی کرنا چاہتا تھا..... میں اس سے محبت کرتا تھا۔ اور اماں نے میرے لئے صبا کو مانگ رکھا تھا۔ بچپن سے ہی اس وقت سے جب خالہ جان اچانک بیمار ہو گئی تھیں اور صبا اماں کی گود میں چلی آئی تھی۔ اور میں جو صبا کے آنے پر بہت خوش تھا ہر وقت اس کے گرد گھومتا رہتا تھا۔ ظاہر ہے گھر میں کوئی دوسرا بچہ نہ تھا اس لئے میں صبا کی آمد پر خوش تھا۔ پھر تب میری عمر ہی کیا تھی صرف تین سال اور ایک سال کی گلابی گلابی گل گوتھنی سی صبا مجھے بہت اچھی لگتی تھی اور اکثر اسے گود میں اٹھانے کی کوشش میں اسے گرا دیتا اور شاید تب ہی اماں نے صبا کو میری دلہن بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور جب دو سال بعد خالہ جان مکمل صحت یاب ہو گئیں اور صبا کو سنبھالنے کے قابل تب وہ صبا کو لے گئیں اور تب تک جمال میاں بھی تشریف لا چکے تھے۔ اس لئے مجھے صبا کی کمی بالکل محسوس نہ ہوئی۔ لیکن اماں نے صبا کو خالہ جان کی جھولی میں ڈالتے ہوئے ان کا کان میں بات ڈال دی تھی۔

''آپا صبا میری امانت ہے۔ یاد رکھیے گا میری کمال کی دلہن۔'' اور پھر وقتاً فوقتاً وہ اس کی یاد دہانی بھی کرواتی رہیں۔ لیکن میں تو اس بات سے قطعی بے خبر تھا اس لئے جب اماں نے مجھے لکھا۔

''کمال! پڑھائی ختم ہوتے ہی لوٹ آنا...... جاب وغیرہ مت کرنا۔ آپا صبا کے

لئے پریشان رہتی ہیں' ان کی پرانی بیماری لوٹ آئی ہے۔ دراصل ان کو ٹی۔ بی تھی، اور وہ اپنی زندگی میں ہی صبا کو اپنے گھر میں آباد دیکھنا چاہتی ہیں۔''

ایک لمحہ کو تو میں ششدر رہ گیا تھا۔ صبا کے لئے تو میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا۔ امی کی آمد سے پہلے بھی کبھی میرے دل میں اس کا اس طرح سے خیال نہیں آیا تھا۔ حالانکہ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ لیکن محبت تو ذات سے ہوتی ہے۔ شکل وصورت حسن وخوبصورتی سے نہیں۔

تب میں نے اماں کو ساری تفصیل لکھ دی کہ میں افی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ یہ خیال تب سے میرے دل میں ہے جب وہ ہمارے گھر آئی تھی اور یہ خیال اب اتنا پختہ ہو چکا ہے کہ اسے دل سے کھرچا نہیں جا سکتا۔ میں نے ان اڑھائی سالوں میں کبھی کسی کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا اس لئے کہ میرے دل میں کسی کے لئے جگہ نہ تھی۔ وہ بھرا ہوا اور آباد تھا۔

کلاس کی خوبصورت ترین لڑکی این بھی مجھے اپنی طرف متوجہ نہ کر سکی۔ ایک بار اس نے بے حد حیران ہو کر مجھ سے پوچھا تھا۔

''کیا تمہاری کسی سے کمٹ منٹ ہے؟''

''ہاں......'' اور اس کی آنکھوں میں دم توڑتی امیدوں کو نظر انداز کرتا میں وہاں سے چلا گیا تھا۔ یہ امریکن لڑکیاں بھی عجیب ہوتی ہیں اس کوشش میں رہتی ہیں کہ کوئی پاکستانی یا ہندوستانی انہیں شادی کی آفر کرے اور وہ اسے قبول کر لیں۔ ان میں گھر بسا کر رہنے کی شدید خواہش چھپی ہوتی ہے۔ حالانکہ اکثریت کے گھر نہیں بن پاتے' بس وقتی ساتھی ہوتا ہے جو اُن کے ساتھ ساتھ ان کے اپارٹمنٹ کو بھی شیئر کرتا ہے اور پھر ذرا سے اختلافات پر دونوں اپنی اپنی راہ پر چل پڑتے ہیں۔ اور اب یہ کیسے ممکن تھا کہ صبا کے لئے کوئی جگہ بن پاتی۔ مجھے اماں اور بابا کی وسعت نظر کا پتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ انہیں میری پسند پر اعتراض نہیں ہوگا۔ پھر افی سے وہ خود کتنا پیار کرتی تھیں۔ لیکن میرا یقین غلط ہو گیا۔ خط ملتے ہی اماں کا فون آ گیا۔

''یہ ناممکن ہے کمال! تمہاری شادی صبا سے ہی ہوگی...... اور یہ آج کی بات تو نہیں ہے۔ میں نے برسوں سے آپا سے کہہ رکھا تھا۔ اور جانتے ہو آپا کے سسرال میں کتنوں نے ہی صبا کو مانگا لیکن آپا نے سب سے یہی کہا کہ صبا کو تو میں نے تمہارے لئے مانگ رکھا ہے اور اب تم چاہتے ہو کہ آپا کو سسرال میں شرمندگی ہو۔ کتنے اچھے اچھے رشتے تمہارے لئے آپا نے ٹھکرائے۔ ان کی نند کا بیٹا تو تم سے بڑا افسر تھا۔ ہم سے زیادہ دولت مند تھے۔''

''مگر اماں پلیز' جمال بھی تو ہے نا۔ آپ صبا کی شادی جمال سے بھی تو کرسکتی ہیں۔''

میں نے التجا کی' لیکن اماں تو میری بات سننے کو تیار ہی نہ تھیں۔ کسی طور بھی۔ تب میں نے سوچا تھا' خط میں یا فون پر میں اماں کو منا نہیں سکتا۔ وہاں جا کر میں انہیں قائل کرلوں گا۔ خود خالہ جان سے بات کرلوں گا...... جمال سے پوچھ لوں گا۔ جمال میں کیا کمی تھی یقیناً خالہ جان کو انکار نہیں ہوگا۔ لیکن اماں نے اتنی جلدی کی۔ میرے آنے کا بھی انتظار نہیں کیا اور میرے آنے سے صرف تین دن پہلے افزا کو حمید اللہ علوی سے بیاہ دیا۔

حمید اللہ علوی جو تین جوان بچوں کا باپ تھا۔ میں نے گھر آتے ہی چاروں طرف اسے تلاش کیا تھا اور جب وہ نظر نہ آئی تو میں نے نہال سے پوچھا تھا۔

''افی کہاں ہے؟''

''بجو!'' پتا نہیں کیوں مجھے اس کی آنکھوں میں اداسی سی نظر آئی تھی۔ ''ان کی شادی ہوگئی' تین دن پہلے حالانکہ میں نے اور جمال نے کتنا کہا تھا اماں سے کہ آپ کا انتظار کر لیں...... جبکہ تین دن بعد آپ آ ہی رہے تھے۔ اور وہ ہماری بہنوں کی طرح تھی...... ہم تو بہت دھوم دھام سے اس کی شادی کرنا چاہتے تھے...... اور پھر ......'' اس کی آواز بھرآ گئی۔ ''کسی ایسے شخص سے ہرگز نہیں جو تین بچوں کا باپ بھی ہو۔''

میں ساکت بیٹھا تھا جیسے کسی نے میری روح کھینچ لی ہو۔

''پتا نہیں اماں اور بابا کو کیا جلدی تھی۔ وہ تو اتنی پیاری تھی کہ کوئی بھی شخص اسے اپنی شریک زندگی کر کے فخر محسوس کرتا...... پھر ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی۔''

وہ ذرا سا خاموش ہوا اور پھر دوبارہ بولنے لگا۔

''جمال نے تو اماں سے لڑائی بھی کی۔ آپ کو تو پتا ہے نا غلط بات اس سے برداشت ہی نہیں ہوتی۔ اس نے اماں سے کہا۔ ''آپ کو اتنی جلدی تھی' اتنی بھاری ہوگئی تھی تو مجھ سے کہا ہوتا...... میں ڈھونڈ لیتا کوئی رشتہ اس کے لئے جو اس کا ہم عمر ہوتا۔ لیکن آپ نے......''

''اماں کا خیال ہے کہ حمید اللہ نے بہت چاہت سے اسے اپنایا ہے اور اس کے پاس پیسے کی فراوانی ہے اور وہ افی کو خوش رکھے گا۔ آپ ہی بتایئے بھیا کیا دولت سے آدمی کو خوش رکھا جا سکتا ہے۔ کیا افی بجو خوش ہوں گی۔ وہ تو اس قدر روئی تھیں کہ جل تھل کر دیا تھا انہوں نے۔''

میرے اندر سب کچھ ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔ یہ اماں نے کیا کر دیا تھا۔ اور کیوں؟ بھلے وہ میری بات نہ مانتیں۔ میری شادی صبا سے ہی کر دیتیں لیکن افی پر یہ ظلم نہ کرتیں۔ اس نے کیا بگاڑا تھا ان کا' ایک بیٹی کی طرح ان کی خدمت کی تھی۔ نہیں چاہا تھا۔ جمال اور نہال سے سگی بہنوں جیسی محبت کی تھی۔ غلطی تو میری تھی قصوروار تو میں تھا۔ پھر مجھے سزا دی ہوتی۔ اسے کیوں سزا دی۔

پتا نہیں نہال نے اور کیا کیا کہا تھا۔

میں نے کچھ سنا ہی نہیں۔

جمال کپڑے تبدیل کر کے آیا تو وہ بھی ناراضگی کا اظہار کر رہا تھا...... مگر میرے اندر تو جیسے سب کچھ مر گیا تھا...... ختم ہو گیا تھا۔

ہولے ہولے میرا دل پاتال میں گرتا جا رہا تھا۔ میں چپ بیٹھا تھا۔

''بھائی! آپ تھک گئے ہیں شاید۔ کچھ دیر آرام کرلیں۔ اتنی طویل فلائٹ۔''

جمال نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تو مجھے لگا جیسے میں بھربھری مٹی کی دیوار کی طرح بیٹھا جارہا ہوں۔

''کمال بھائی!'' جمال نے گھبرا کر مجھے سہارا دیا۔

''کیا ہوا آپ کو؟''

میں نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔

''آپ واقعی تھک گئے ہیں کمال بھائی! آپ آرام کریں۔ رات کو کھانے پر باتیں ہوں گی۔''

جمال نے خود ہی اندازہ لگایا۔ میں پتا نہیں کیسے اپنے کمرے تک آیا تھا۔ مجھے یاد نہیں۔ جمال مجھے آرام کرنے کی تاکید کرکے چلا گیا اور میرا دل چاہ رہا تھا میں چیخ چیخ کر روؤں اپنی بے بسی اور افی کی بدنصیبی پر۔

یہ میں ہی تھا جس کی وجہ سے اماں نے یہ فیصلہ کیا تھا۔ شاید وہ سمجھتی تھیں کہ میرے آنے سے پہلے افی اپنے گھر کی ہو جائے گی تو میں کچھ نہ کرسکوں گا.... وہ خالہ کے سامنے سرخرو ہوگئی تھیں لیکن میرا سر تو ہمیشہ کے لئے اپنے سامنے جھک گیا تھا۔

میرا جی چاہ رہا تھا' میں اپنے آپ کو سزا دوں' کوئی سخت سزا' کوئی ایسی سزا کوئی ایسی تکلیف جو میرے غم کا مداوا کرسکے جو احساس ندامت ختم کردے۔

میں نے اپنا گریبان چاک کرلیا۔

اپنے آپ کو زخمی کرڈالا اور اپنا سر زور زور سے بیڈ کی سائیڈ پر مارا۔

خدایا میں کیا کروں' میرے پاس کچھ نہیں بچا تھا' میں ایک دم خالی ہوگیا تھا۔ جانے کتنی دیر گزر گئی تھی۔ مجھے خبر نہیں ہوئی...... میں زمین پر بیٹھ گیا تھا۔ اور اپنا سر پلنگ کی پٹی پر رکھ دیا تھا اور بلک بلک کر رونے لگا۔ میں نے کتنی بار ہاتھ اٹھا کر آنسو پونچھنے کی کوشش کی لیکن

میرے رخسار خشک تھے۔

آنکھیں تپتے صحرا کی طرح دمک رہی تھیں اور روتے روتے میری آواز بیٹھ گئی تھی۔ میں یونہی بیٹھا تھا جب میرے وجود میں ارتعاش پیدا ہوا۔ میری سماعتوں میں جیسے گھنٹیاں سی بجیں۔ یہ آواز..... اس آواز کو سننے کے لئے یہ اڑھائی سال تڑپا تھا۔

''نہال! نہال!'' وہ نہال کو بلا رہی تھی۔ ''کمال بھائی آگئے کیا؟ اور یہ کہاں چھپ گئے ہیں۔''

اس کی آواز میں زندگی تھی۔ زندگی کا رس تھا خوشیوں کی لے تھی۔

میں لڑکھڑاتے ہوئے اٹھا۔

زری کے کام والے سبز رنگ کے سوٹ میں ملبوس ایک ہاتھ میں سونے کی چوڑیاں دوسرے ہاتھ میں بریسلیٹ ہلکا سا سوٹ کے ساتھ میچنگ زمرد کا سیٹ۔

یہ روپ..... نہیں اس روپ میں تو میں نے صرف اسے اپنے لئے دیکھا تھا' لیکن یہ کون تھا' اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے کچھ کہتا ہوا۔

''حمید اللہ علوی!''

نہال نے جیسے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''افی کا دولہا۔ تین بچوں کا باپ''

میں تہی داماں رہ گیا تھا' خالی ہوگیا تھا۔ میں جس نے اسے برسوں سوچا تھا۔ امریکہ جیسے ملک سے خود کو اس کے لئے صرف اس کے لئے بچا کر لے آیا تھا...... خالی کھڑا تھا۔

میں نے اپنے خالی ہاتھوں کو دیکھا..... اپنے سونے دل کو دیکھا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

میں ایک بار پھر دیواروں سے سر مارنے لگا پھر شاید جمال اور نہال نے میری آوازیں سن لی تھیں۔ وہ بھاگتے ہوئے میرے کمرے میں آئے تھے۔ جمال نے مجھے اپنی

باہوں میں لے لیا تھا۔

''کمال بھائی!''

''جمال! مجھے یہاں سے لے چلو..... انہوں نے اماں نے' بابا نے' مجھے لوٹ لیا ہے۔ میرا دل خالی کر دیا ہے۔''

میں اس سے لپٹ گیا تھا۔ جمال کتنی ہی دیر تک مجھے اپنی باہوں میں بھینچے رہا اور میں روتا رہا' سسکتا رہا۔

پھر جانے منظر کیسے بدل گیا تھا۔ میں ہوش میں آیا تو ہاسپٹل کے ایک کمرے میں تھا۔ میرے سامنے اماں تھیں' بابا تھے' جمال تھا' نہال تھا لیکن میں کسی کو نہیں پہچانتا تھا' بس خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھتا ڈاکٹر آتے اور پوچھتے۔

''ہیلو ینگ مین! کیا تکلیف ہے تمہیں۔؟''

''ہاں' تکلیف تو کوئی نہیں' بس اندر خالی خالی لگتا ہے' ڈاکٹر! اندر بھر دو۔ وہاں کچھ نہیں ہے۔''

اماں سر جھکائے روتیں۔ اور میں حیران ہو کر سوچتا..... یہ عورت کیوں روتی ہے میرا اس سے کیا ناتا ہے..... دن رات میرے سرہانے بیٹھی رہتی ہے۔ ایک بار نہیں کئی بار میں اس سے پوچھتا کہ میرا آپ کے ساتھ کیا رشتہ ہے معزز خاتون؟''

''میں تمہاری ماں ہوں بیٹا! تم مجھے کیوں نہیں پہچانتے۔''

''نہیں میری تو کوئی ماں نہیں ہے۔ معزز خاتون! میں تو شاید آسمان سے ٹپکا تھا۔ نہیں جہاز سے گرا تھا...... مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بڑے جہاز نے مجھے نیچے گرایا تھا.... جب میری آنکھ کھلی تو میں یہاں تھا اس ہاسپٹل میں۔''

مجھے بجلی کے شاک لگائے جاتے۔ میں تڑپتا۔ میں اپنا آپ کھو بیٹھا تھا۔ اور مجھے واپس پلٹنے میں دو سال سے زیادہ لگ گئے.... تب تک اماں بابا سب وہ گھر چھوڑ کر یہاں

لاہور ہی سیٹل ہو گئے تھے۔ یوں بھی بابا نے ریٹائرمنٹ لے لی تھی اور اماں کا خیال تھا کہ میں بیمار ہوں ہاسپٹل میں ہوں تو وہ میرے قریب رہنا چاہتے ہیں۔ اماں نے اس شہر سے ہی ناتا توڑ لیا تھا۔ جہاں وہ رہتی تھی۔ گھر میں کبھی اس کا ذکر نہ ہوتا۔ کبھی نہال یا جمال کے منہ سے اس کا نام نکلتا تو وہ فوراً خاموش ہو جاتے..... میں جانتا تھا کہ اماں نہیں چاہتیں کہ میں پھر کبھی اس کا سامنا کروں اور ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جاؤں..... میں نے چپ سادھ لی تھی۔

میں نے کبھی کسی سے گلہ نہیں کیا۔

نہ اماں سے نہ بابا سے۔

اور اماں کے کہنے پر صبا سے شادی بھی کر لی۔

وہ جو اتنے عرصہ سے میرے انتظار میں بیٹھی تھی اسے میں کس جرم کی سزا دیتا۔ اماں اور بابا نے سب سے یہی کہا تھا کہ ایئرپورٹ سے گھر آتے ہوئے میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا..... دماغ پر چوٹ لگی۔ جس سے ذہن متاثر ہوا۔ اور میرے لئے صبا نے انتظار کیا تھا۔ وہ چاہتی تو شادی کر سکتی تھی حالانکہ خالہ نے کہا بھی تھا کہ کمال نہیں تو جمال ہی سہی اور اماں کو بھی اعتراض نہ تھا لیکن صبا نے انکار کر دیا۔

''کمال کے ساتھ یہ حادثہ مجھ سے شادی کے بعد بھی ہو سکتا تھا پھر...... میں کمال کے صحت مند ہونے کا انتظار کروں گی۔''

صبا کی اس اعلیٰ ظرفی نے مجھے متاثر کیا تھا' لیکن صبا سے شادی کا فیصلہ کرنے سے چند دن پہلے میں نے کسی طرح حمید اللہ علوی کا فون نمبر لے کر اسے فون کیا تھا.... پتا نہیں کیوں جی چاہتا تھا ایک بار اس کی آواز سن لوں۔

''کمال بھائی!'' میری آواز سن کر وہ حیران رہ گئی تھی۔ ''آپ ٹھیک ہیں۔''

''میں ٹھیک ہوں افی! تم خوش ہو؟ ٹھیک ہو؟''

''ہاں میں خوش ہوں۔'' میں نے اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی محسوس کی تھی۔

''ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا افی! اماں اور بابا نے تمہارے ساتھ جو زیادتی کی ہے اس کے لئے میں قصوروار ہوں۔''

''پلیز کمال بھائی! ایسا مت کہیں۔''

''تم نہیں جانتیں افی۔''

''میں سب جانتی ہوں۔ اماں نے مجھے یہاں سے جاتے ہوئے سب بتا دیا تھا..... انہوں نے میرے لئے جو فیصلہ کیا اچھا کیا۔ حمید بہت اچھے..... لیکن..... لیکن آپ سب لوگ مجھے بہت یاد آتے ہیں..... نہال' جمال' اماں' بابا سب۔ لیکن اماں نے کہا تھا۔ میں سب کو بھول جاؤں اس لئے کہ یہی بہتر ہے سب کے لئے۔''

اس نے سسکی لی۔

''انہوں نے کہا تھا' اگر کبھی آپ مجھ سے ملنا چاہیں۔ مجھ سے بات کرنا چاہیں تو میں آپ سے نہ ملوں۔ نہ بات کروں۔ آپ۔ آئندہ مجھے فون نہ کرنا کمال بھائی۔ میں احسان فراموش نہیں کہلوانا چاہتی۔''

وہ رونے لگی۔

''مجھے سب بہت یاد آتے ہیں۔ لیکن میں کیا کروں' کیا کروں۔''

اس نے روتے روتے فون رکھ دیا تھا۔

اور سکندر نے کتنا صحیح کہا تھا کہ انہوں نے افزا پر ظلم کیا..... اس لئے کہ وہ ان کی سگی بیٹی نہ تھی۔ اگر وہ سگی بیٹی ہوتی تو ایسا ہرگز نہ کرتے۔

میں نے راتوں کو اماں اور بابا کو اس کی باتیں کرتے سنا ہے' اماں اکثر اسے یاد کر کے رویا کرتی تھیں۔

بابا ٹھنڈی آہیں بھرتے۔

جمال اور نہال اداس پھرتے۔

لیکن ظلم تو ہو گیا تھا' اس کے ساتھ۔ وہ بھری جوانی میں بیوہ ہو گئی۔

اور پھر اس نے کتنی تکالیف اٹھائیں۔ ان کی تفاصیل تو سکندر نے نہیں بتائی تھیں۔

لیکن ان تکالیف کے نشانات اس کے وجود پر ثبت تھے..... مگر اس نے ہمیں نہیں پکارا اماں کے ساتھ کیا ہوا عہد نبھایا۔

اور اگر وہ ہمیں بلاتی تو کیا نہال' جمال' اماں' بابا اس کی طرف نہ جاتے۔ اسے سینے سے نہ لگا لیتے۔ وہ تو سمجھتے تھے کہ وہ حمید اللہ علوی کے ساتھ خوش ہے' مطمئن ہے۔ میرا جی چاہا' میں سکندر کو سینے سے لگا لوں۔ اسے بہت پیار کروں اور اس کے وہ نامعلوم آنسو جو دکھائی نہیں دیتے تھے لیکن جن کی نمی میں اپنے دل میں محسوس کر رہا تھا اپنے ہاتھوں سے پونچھوں۔ مجھے اس کے وجود سے افزا کی خوشبو آ رہی تھی لیکن بارِ ندامت سے میری نظریں نہیں اٹھ رہی تھیں۔

''افزا علوی جب مری تو میں گیارہ سال کا تھا۔''

وہ کہہ رہا تھا اور میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ اپنی ماں کا ذکر کس طرح کر رہا تھا۔ جیسے وہ اس کی ماں نہ ہو' کوئی اجنبی عورت ہو۔

شاید زندگی نے اس کے ساتھ بہت اچھا سلوک نہیں کیا۔ گیارہ سال کی عمر میں اکیلا رہ گیا تھا۔ اور افزا۔

اف اتنا عرصہ قبل دنیا چھوڑ گئی تھی' مگر میرے دل میں تو وہ ہمیشہ رہی تھی۔ میرا دل رو رہا تھا۔ لیکن میں ضبط کیے بیٹھا رہا۔ اور میں نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ میں اسے ناکام نہیں لوٹاؤں گا۔ حالانکہ صبا نے مخالفت کی تھی۔

''اس کا کوئی خاندان نہیں۔ نہ ماں نہ باپ نہ بہن بھائی..... اکیلے لڑکے کو اوج کا رشتہ دیتے میرا دل نہیں مانتا۔''

''پاگل ہو تم..... اوج اس کے ساتھ کام کرتی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ یہاں تک یونہی چلا آیا ہے۔ یقیناً دونوں کے درمیان پسندیدگی کا کوئی جذبہ رہا ہوگا تب ہی تو۔''

لیکن اوج نے میرے خیال کی نفی کر دی۔ وہ سکندر سے شادی کے لئے رضا مند نہ تھی اس کا خیال تھا کہ اس کا مزاج بہت عجیب سا ہے...... وہ دوسروں کو بے بس دیکھ کر خوش ہوتا ہے...... بے شمار خوبیوں کے باوجود شادی کے لئے وہ موزوں نہیں ہے۔ لیکن میں نے اسے سمجھایا کہ وہ اپنی محبت سے اسے جیت لے۔ اسے اس کے حصار سے باہر لے آئے۔ زمانے نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا مگر وہ ایک بہترین انسان ہے...... میں چاہتا تھا اوج کے ساتھ۔ اس کی شادی کر کے میں اس دکھ کی' اس زیادتی کی تلافی کر دوں جو اماں اور بابا نے اس کے ساتھ کی تھی یا صرف اماں نے' بابا نے ایک بار کہا تھا۔

''یہ فیصلہ تنہا تمہاری اماں کا تھا۔ میں اس میں شریک نہ تھا۔''

پھر وہ افزا کا بیٹا تھا اور اس سے بڑھ کر مجھے اور کون عزیز ہو سکتا تھا...... اوج بہت ذہین ہے' ہمیشہ سے اس نے میری خواہش جان لی تھی سو اس نے ہاں کر دی۔

میرا خیال تھا وہ محبتوں سے دور اجنبیوں میں پلا ہے' محبتوں کے ذائقے سے ناآشنا ہے۔ اس لئے اتنا کھردرا اور اتنا سخت ہے۔ ایک گھر بنے گا محبت ملے گی تو خود ہی بدل جائے گا...... لیکن ایسا نہ ہو سکا۔

میں نے کئی بار اوج سے پوچھا تھا کہ کیا وہ خوش ہے۔ اگرچہ وہ اثبات میں جواب دیتی تھی' لیکن اس کی آنکھوں میں مجھے ایک الجھن دکھائی دیتی تھی۔ اس کے چہرے پر وہ خوشی مفقود تھی جو نئی نویلی دلہنوں کے چہرے پر ہوتی ہے۔ کیا میں نے اوج کی شادی سکندر کے ساتھ کر کے غلطی کی ہے۔ ایک غلطی ایک زیادتی کی تلافی کرنے کے لئے کیا میں ایک اور زیادتی کا مرتکب ہو چکا ہوں......

میں نے کئی بار سوچا اور پھر ایک دن اوج چلی آئی' تھکی ہاری اور درماندہ۔ وہ ہمت ہار گئی تھی۔ میرے سینے سے لگی کتنی ہی دیر تک روتی رہی...... اور میں نادم ہوتا رہا۔ میں نے سوچا تھا سکندر سے بات کروں گا اسے سمجھاؤں گا لیکن اوج تو کوئی بات سننے کو تیار ہی نہ تھی۔

''مجھے واپس نہیں جانا مجھے سکندر سے بات نہیں کرنا۔''

وہ بہت ہرٹ ہوئی تھی۔ سکندر نے اسے بہت تکلیف دی تھی..... کاش...... اے کاش سکندر اور اوج ہمیشہ اکٹھے رہ سکتے..... میرا برسوں کا خالی دل سکندر کو دیکھ کر' اسے اپنا کر بھر گیا تھا۔ مجھے لگتا تھا' میں اب تہی داماں نہیں رہا۔

اسے دیکھ کر میری آنکھیں ٹھنڈی ہوتیں۔ اور میرے وجود پر دھری غم کی سلیں ہٹتی جا رہی تھیں۔

لیکن اب ایک بار پھر میرے دل پر جیسے کسی نے بھاری سلیں دھر دی تھیں۔ میں اوج کی پریشان صورت دیکھتا تو میرے اندر کوئی روتا۔

پھر بلال اور صبا خلع کی بات کرنے لگے۔

''ابھی وہ ینگ ہے۔ ابھی نئی زندگی کا آغاز کر سکتی ہے...... بھائی جان طلال کے لئے خواہاں ہیں۔''

صبا کہتی تو میرے دل میں جیسے بھالے اتر جاتے۔ میں اندر سے زخم زخم ہو جاتا۔ لیکن اوج نے خلع لینے سے صاف انکار کر دیا۔

میں نے دیکھا' اس کی آنکھوں میں انتظار تھا..... سکندر کا انتظار۔ وہ فون کی بیل پر چونکتی' لپک کر ریسیور اٹھاتی' اس کا غصہ اتر چکا تھا۔ اور اسے سکندر کا انتظار تھا۔ تب میں اسد ملک کی طرف چلا گیا۔ میں جاننا چاہتا تھا۔ سکندر کہاں ہے...... اور تب اسد ملک نے جو کچھ مجھے بتایا۔ مجھے لگا جیسے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ جیسے غم کی بھاری سلیں میرے سینے سے ہٹ گئی ہیں...... جیسے میں نے اس زیادتی کی تلافی کر دی ہے۔ جو برسوں پہلے افزا کے ساتھ ہوئی تھی۔

جس روز سکندر آیا تھا تو میں نے اسد ملک کے ساتھ اسے ایئر پورٹ پر ریسیو کیا۔

لیکن میں نے اوج کو نہیں بتایا۔

اسد نے کہا تھا کہ ”سکندر اس طرح اوج کے پاس جانا چاہتا ہے کہ اس کی ذات میں کوئی گنجل نہ ہو۔ کوئی ابنارملیٹی نہ ہو........“

اور میں نے سکندر کا بھرپور ساتھ دیا...... حالانکہ اوج کو اداس دیکھ کر کتنی بار میرا جی چاہا کہ میں اسے بتا دوں‘ سکندر کے متعلق لیکن پھر سکندر کی ہدایت کا سوچ کر چپ ہو جاتا۔

بالآخر وہ دن آ گیا جب ڈاکٹر صدیقی نے اسے اوکے کر دیا۔ اس روز مجھے سکندر پر بہت پیار آیا........ میں کتنی دیر تک اسے گلے سے لگائے کھڑا رہا۔ اپنی ذات کے حصار سے نکل کر وہ بہت خوش اور مطمئن تھا۔

اس کی آنکھوں کا حزن جو مسلسل دھند کی طرح اس کی آنکھوں میں چھپا یا رہتا تھا اور اس کے پورے وجود سے جھلکتا تھا۔ آج نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں محبتوں کے سمندر مچل رہے تھے اور خوشی پورے وجود سے پھوٹی پڑ رہی تھی.......

بالآخر اوج کے لئے‘ اس کی محبت کی خاطر اس نے خود کو اس حصار سے نکال لیا تھا جو اس کی ذات کی روشنیوں کو کھائے جا رہا تھا.......

”انکل!“ شدتِ جذبات سے اس کی آواز بھرا رہی تھی۔ میں نے اسے خود سے لپٹا لیا تھا‘ ڈاکٹر صدیقی کے پاس میں نے اس کی فائل میں اس کی خودنوشت پڑھی تھی۔ میں نے اس کے کندھے تھپکے تھے۔ اور اسے اپنے ساتھ لے کر جب میں گھر کی طرف آ رہا تھا۔ تو میرا دل بھرا ہوا تھا........ برسوں بعد مجھے لگا تھا جیسے میرا خالی دل آباد ہو گیا ہو۔ گھر میں رونق لگی تھی۔

جمال اور نہال کسی سرپرائز کے انتظار میں گھر میں موجود تھے۔ جمال تو اکیلا ہی اوج کی شادی میں صرف ایک دن کے لئے شریک ہونے آیا تھا جبکہ نہال شریک نہیں ہو سکا تھا اور دو تین ماہ پہلے ہی وہ لوگ وطن واپس آئے تھے........

”سکندر بیٹا!“ ٹی۔ وی لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے میں نے اس کے کندھے پر

ہاتھ رکھے۔

”آج میں تمہیں اوج ہی کو نہیں لوٹا رہا بلکہ تمہارے کچھ کھوئے ہوئے رشتے بھی کو واپس کر رہا ہوں۔“

”یہ تمہارے جمال ماموں ہیں۔ جو خود کو بہت بہادر سمجھتے تھے لیکن.......“

میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”اور یہ تمہارے نہال ماموں ہیں۔ تمہاری ماں کے بہت ہی لاڈلے بھائی...... جو گزر گیا۔ اس کا ذکر مت کرنا اور کچھ مت پوچھنا۔“

”ماموں جان! ماما آپ کو بہت مس کرتی تھیں۔ بہت یاد کرتی تھیں۔ انہوں نے آپ کی ایک ایک بات سینکڑوں بار مجھے بتائی۔“

وہ نہال کے گلے لگا رو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور میرا دل سرشار ہو رہا تھا‘ اس نے افزا کو افزا علوی نہیں کہا تھا‘ ماما کہا تھا...... ڈاکٹر صدیقی نے سچ کہا تھا اس نے اپنی ذات کا حصار توڑ دیا ہے۔

وہ شام جو اس روز میرے گھر میں اتری تھی‘ شاید روئے زمین پر میرے لئے سب سے خوبصورت شام تھی۔ اتنا سکون‘ اتنی خوشی‘ اتنا اطمینان تو میں نے اس روز بھی محسوس نہیں کیا تھا۔ جس روز میں نے اوج کو سکندر کے ساتھ رخصت کیا تھا..... بہت سارے سالوں بعد میں بہت پرسکون نیند سویا تھا۔

اوج سکندر کے ساتھ اپنے گھر چلی گئی تھی اور نہال اور جمال رات گئے تک افزا کی باتیں کرتے اور اسے یاد کرتے رہے تھے.......

اور پھر چند دن بعد سکندر اور اوج کو میں ہالینڈ جانے کے لئے ایئرپورٹ پر رخصت کر رہا تھا۔ وہ دونوں لیزا کی شادی میں شرکت کرنے کے لئے ہالینڈ جا رہے تھے۔

”یہ آخری بوجھ تھا جو میرے دل پر دھرا تھا کہ میں نے اپنے محسن کو مایوس کیا ہے

لیکن لیزا بہت خوش ہے اور سر جان بھی۔ فریڈرک ایک بہترین انسان ہے۔ اب کوئی بوجھ نہیں ہے۔''

سکندر نے جاتے جاتے میرے کانوں میں سرگوشی کی تھی اور میں دھیرے سے مسکرا دیا تھا اس لئے کہ یہ راز تو میں ہی جانتا ہوں کہ میں نے لیزا سے درخواست کی تھی کہ اگر اس کے دل میں ذرا بھی سکندر کا خیال ہے تو وہ شادی کر لے۔ ورنہ وہ پورے طور پر خوش نہ رہ پائے گا۔ اور لیزا نے میری بات رکھ لی تھی۔ اس کا فون نمبر میں نے سکندر کی ڈائری سے لیا تھا اور اس کی فائل سے میں نے جان لیا تھا کہ سکندر کے دل میں یہ احساس ہے کہ اس نے لیزا کو مایوس کیا ہے۔

''لیزا کو میرا بہت پیار دینا اور اس سے کہنا کہ وہ فریڈرک کے ساتھ پاکستان ضرور آئے۔ اپنے انکل کے گھر.......''

''ضرور' بلکہ ہم تو اسے ساتھ لے کر آئیں گے۔'' سکندر نے خوش دلی سے کہا۔ اس کے چہرے پر طمانیت تھی' خوشی تھی' مسرت تھی' اور اس مسرت کے رنگ اوج کے چہرے پر کھل رہے تھے' اس کی آنکھوں میں جگمگ کر رہے تھے۔ وہ دونوں مسکراتے ہوئے مجھے الوداع کہہ رہے تھے۔

اور میرا دل خوشی اور تشکر کے جذبات سے بھرتا جا رہا تھا.........

اختتام